ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدّام القرآن - لاہور

سیرتِ نبویؐ کے ضمن میں ۲ دو عظیم تحفے

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیمِ اسلامی
کے دروس و تقاریر کے دو مجموعے — اعلیٰ دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ:

★ رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم ★

یعنی پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ، اور

فرائضِ دینی اور اسوۂ رسولؐ

سورۂ احزاب رکوع ۲، ۳ کی روشنی میں

تبلیغی مقاصد کے پیشِ نظر ۔۔ ہدیہ صرف چھ روپے فی کتاب ۔۔ محصول ڈاک علاوہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون — ۸۵۲۶۱۱

ذیلی دفتر: ۱۱ داؤد منزل ۔ نزد آرام باغ ۔ کراچی ۱ ۔ فون برائے رابطہ ۲۱۴۷۰۹

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ حکمت قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

مدیر: محمد رفیق چودھری

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

جلد ۳	دسمبر ۱۹۸۴ء مطابق ربیع الاوّل ۱۴۰۵ھ	شمارہ ۱۰

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

فون: ۸۵۲۶۱۱

مضمون نگار حضرات کی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

فہرس

حرفِ اوّل ——— ۳
ڈاکٹر اسرار احمد

حقیقتِ انسان ——— ۵
ڈاکٹر اسرار احمد

حکم و عبر ——— ۱۶
اسلام میں عورت کی گواہی ——— اعتراضات و جوابات
محمد رفیق چودھری

الٓمٓ (سورۃ السجدہ) ——— ۲۹
ڈاکٹر اسرار احمد

ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات ——— ۳۵
سورۂ تغابن کی روشنی میں (قسط ۲)
ڈاکٹر اسرار احمد

اسلام کو حکمائے عصر کے تین چیلنج ——— ۴۳
پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

کتابیات — سیرۃ الخلیل (باب دوم) ——— ۵۲
مولانا الطاف الرحمٰن نبوی

مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت (۲) ——— ۶۰
مولانا محمد طاسین

تبصرۂ کتب ——— ۶۸
محمد رفیق چودھری

سالانہ زرِ تعاون : ۳۰ روپے ——— فی شمارہ : ۳ روپے
مطبع : آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ، لاہور

حرفِ اوّل

بفضل اللہ اب "حکمتِ قرآن" کے مضامین و مقالات میں خاصا تنوّع پیدا ہو رہا ہے۔ حالیہ اشاعت میں حکم و عبر کے اداریے کے تحت مدیر صاحب کا مضمون "عورت کی گواہی، اعتراضات و جوابات" موجود ہے۔ برادرِ محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا سلسلہ وار موضوع "الٓـمّٓ" بھی شامل ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے درسِ قرآن "بعنوان" ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات" (سورۂ تغابن کی روشنی میں) کی دوسری قسط بھی حاضر ہے — پچھلے شمارے میں "حقیقتِ زندگی" کے موضوع میں تسلسل کے لئے "حقیقتِ انسان" کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے کچھ تحریر فرمانے کے ارادے کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ اس مضمون کی پہلی قسط حاضر ہے۔

اس کے علاوہ اس شمارے میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا ایک اہم اور فکرانگیز مضمون "اسلام کو حکمائے عصر کے تین چیلنج" بھی شامل ہے۔ یہ مضمون اگرچہ اس سے قبل "میثاق" (اپریل ۱۹۷۴ء) میں اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ مگر ایک تو اس وقت "میثاق" کی محدود اشاعت کے سبب کم استفادے کے پیشِ نظر اور دوسرے "حکمتِ قرآن" میں اس مضمون کی زیادہ مناسبت کی وجہ سے اسے پھر پیش کیا جا رہا ہے۔ مولانا تقی امینی صاحب کے سلسلہ وار مقالہ "فہم قرآنی کا درجۂ حکمت" کی ایک قسط بھی آگئی ہے۔ "سیرتِ خلیل" کے عنوان سے مولانا الطاف الرحمٰن بنوی صاحب کے سلسلہ وار مضمون کی قسط بھی شاملِ اشاعت ہے۔ مضاربت پر مولانا محمد طاسین صاحب کے مقالے کی اب دوسری قسط دی جا رہی ہے غالباً دو اور اقساط میں یہ مقالہ مکمل ہو جائے گا۔ آخر میں تبصرۂ کتب کے مستقل عنوان کے تحت چند کتابوں پر تبصرے بھی شامل ہیں۔

اللہ کے فضل و کرم سے قرآن اکیڈمی کے دو سالہ تعلیمی کورس میں طلبہ کی تدریس کا کام بطریقِ احسن ہو رہا ہے۔ ابتدائی ایک سال خصوصیت کے ساتھ عربی زبان سیکھنے اور اس میں صرفی و نحوی اعتبار سے پختگی پیدا کرنے پر کامل توجہ دی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر

بقیہ صفحہ ...

قارئین "ماہنامہ حکمت قرآن" اور "ماہنامہ میثاق" متوجہ ہوں!

تحریک تجدید ایمان - توبہ - تجدید عہد اور دعوت رجوع الی القرآن کے یہ دونوں نقیب و ترجمان پاکستان میں حسب ذیل پتوں سے مل سکتے ہیں۔ نیز جدید سالانہ خریداری کے اجراء یا قدیم سالانہ خریداری کی تجدید کے لئے سالانہ زر تعاون بھی ان مقامات پر جمع کرایا جاسکتا ہے۔

کراچی: دفتر تنظیم اسلامی کمرہ ۱۱ داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت۔

شائننگ ٹریڈرز، رفیع مینشن بالمقابل آرام باغ شاہراہ لیاقت فون ۲۱۴۷۰۹۔

نوٹ: ان دونوں مقامات سے محترم ڈاکٹر صاحب کے دروس و خطابات کے کیسٹ بھی مل سکتے ہیں۔

پشاور: دفتر تنظیم اسلامی، شاہ بلڈنگ پل پختہ نزد چوک یادگار پشاور۔

ملتان: عبدالغنی صاحب، ملتان پولٹری کارنر، بالمقابل فاطمہ جناح ہسپتال ملتان۔ فون ۷۵۸۹۱۔

کوئٹہ: دفتر تنظیم اسلامی جناح روڈ کوئٹہ اور قاری افتخار احمد صاحب خطیب مسجد طوبیٰ مسجد روڈ کوئٹہ فون نمبر ۷۷۲۶۵۔

راولپنڈی: فیری اینڈ اسکوائر ۱ - بی - ۱۴ راولپنڈی سٹلائٹ ٹاؤن فون ۴۳۷۲۶۔

گوجرانوالہ: جناب پاشا بارودن برکی، بی - ۵۸۱ سٹلائٹ ٹاؤن۔

سیالکوٹ: ریٹائرڈ کمانڈر، محمد طفیل صاحب مکان نمبر ۲۲۸ عزیز بھٹی روڈ سیالکوٹ کینٹ۔

وہاڑی: راؤ محمد جمیل سینٹری انسپکٹر میونسپل کمیٹی وہاڑی۔

ایبٹ آباد: خالد وحید صاحب سی - ۱۷۴۹ سول لائنز۔ فون نمبر ۲۳۰۲، ۴۴۲۹۔

فیصل آباد: دفتر تنظیم اسلامی بالمقابل گورنمنٹ رحمانیہ ہائی سکول در مکان حاجی عبدالواحد قیم تنظیم، پیپلز کالونی فون نمبر ۴۳۳۴۰۹۔

سوات: فلک سیر کارپوریشن۔ جی ٹی روڈ، منگورہ۔

اسلام آباد: بسم اللہ خان صاحب بی / ۲۷۸ II / 6 G۔

حویلی لکھا: محمد امین صاحب نزد مرکزی جامع مسجد مین بازار۔

"میثاق اور حکمت قرآن" ہر دو کا علیحدہ علیحدہ سالانہ زر تعاون اندرون ملک -/۳۰ روپے ہے جب کہ دوسرے ممالک کے لئے زر تعاون حسب ذیل ہے:

- کینیڈا -/۱۵۰ روپے یا ۱۵ کینیڈین ڈالر۔
- امریکہ، افریقہ، مغربی جرمنی، نائیجیریا -/۱۵۰ روپے یا ۱۲ امریکن ڈالر۔
- انگلینڈ، ناروے، متحدہ عرب امارات -/۱۰۰ روپے یا ۱۰ امریکن ڈالر۔
- سعودی عرب، ابوظہبی، مصر، ایران -/۶۰ روپے یا ۶ امریکن ڈالر۔
- انڈیا -/۵۰ روپے یا ۵ امریکن ڈالر۔

حقائق و معارف

حقیقتِ انسان

اسرار احمد

منصور کا یہ کہنا کہ: "خدا ہوں مَیں!" ایک انتہا پر ——— اور ڈارون کا یہ "بولنا" کہ: "بوزنا ہوں میں!" دوسری انتہا پر ——— لیکن کیا یہ معاملہ ایسا ہی غیر اہم ہے کہ کوئی "دوست" اسے ہنستے ہوئے یہ کہہ کر ٹال دیں کہ: ——— "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست!"[1]

سوال یہ ہے کہ حقیقت یہ ہے یا وہ؟ ——— اور اگر ان دونوں کے مابین واقع ہوئی ہے تو کہاں؟ ——— اور اگر یہ دونوں ہی باتیں درست ہیں تو کیسے؟

"ایاز قدرِ خود بشناس!" کو معلوم کیوں ایک تحقیر آمیز تنبیہ ہی کے مفہوم میں لے لیا گیا ہے! کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ بحیثیتِ انسان اپنے حقیقی مرتبہ و مقام کو پہچاننے کی مشفقانہ نصیحت ہو؟ یعنی بقول اقبالؔ ع "اپنی خودی پہچان او غافل افغان!"[2] یا بقولِ بیدلؔ ع "اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہشیار باش!" ——— اس لئے کہ یا تو یہ مانا جائے کہ محمودؔ اور ایاز کی روائتی محبت بس

---

[1] حضرت اکبر الٰہ آبادی کا قطعہ ہے:

کہا منصور نے خدا ہوں مَیں — ڈارون بولا بوزنا ہوں مَیں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست — فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست!

[2] اقبالؔ کا مصرعہ ہے ع "اپنی خودی پہچان او غافل افغان!"

ایک قصہ ہی ہے ——— یا پھر اس دوسرے امکان ہی کو ماننے بنے گی، ؎

نہ در بازی بُود دل داد محمود   دلِ محمود را بازی میپندار!!

سب جانتے ہیں کہ 'خدا ناشناسی'، تمام بُرائیوں کی جڑ اور جملہ گناہوں اور جرائم کی ماں ہے، لیکن بہت کم ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ اس سب سے بڑے گناہ کی نقد سزا جو اس دُنیا ہی میں انسان کو ملتی ہے کیا ہے! ——— 'خود فراموشی'! بمصداقِ الفاظِ قرآنی :

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ   (ترجمہ) اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو
نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ   جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ
أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝   نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا
(الحشر: ۱۹)   یہی لوگ بدکار ہیں!

ہندسہ میں ہر دعوٰی (THEOREM) کا ایک عکس (CONVERSE) ہوتا ہے چنانچہ اس 'دعوٰیٔ حق' کا عکس بھی کسی عکاسِ حقیقت کی زبانی یوں ادا ہوا کہ :

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ   (ترجمہ) جس نے اپنے آپ کو پہچان
عَرَفَ رَبَّهُ ۔   لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

تو کیا واقعی عرفانِ خویش اور معرفتِ رب لازم و ملزوم ہیں اور 'حقیقتِ انسان'، اور ذاتِ ربّانی میں اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہے؟

ان مسائل کے حل کے ضمن میں اگر انسان صرف حواسِ ظاہری سے حاصل شدہ معلومات اور محض اُن ہی پر مبنی استدلال پر دارومدار رکھتے تو جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان بھی بس ایک حیوان ہے ——— دوسرے حیوانات کے مقابلے میں ذرا ترقی یافتہ حیوان! ——— البتہ وجدان کی

وادیوں میں پرواز کی جائے جیسے عظیم شعراء نے کی تو حقیقت کچھ اور نظر آتی ہے ——— اور مسئلے کا پورا تشفی بخش حل تو وحیٔ آسمانی کی دستگیری کے بغیر ممکن ہی نہیں!

ایک 'واقف' و عارف بزرگ کے سامنے شکوہ کیا گیا: "حضرت! اب تو "انانیت" کا دور دورہ ہے اور ہر شخص اس مہلک مرض میں گرفتار ہو چکا ہے!" ——— اس پر انہوں نے فرمایا: "بھائی! واقعہ تو یہ ہے کہ 'انانیت' کا دور بھی گذر چکا، اب تو نری 'نانیت' ہی 'نانیت' رہ گئی ہے!"[۳]

اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ دورِ حاضر کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ آج کا انسان اپنے آپ کو محض ایک حیوان تصور کرتا ہے۔ انسانوں کی عظیم اکثریت تو اپنی عظمت سے بالکلیہ بے خبر اور اپنی حقیقت سے قطعی طور پر لاعلم، محض اپنی مادّی ضرورتوں اور حیوانی تقاضوں کی تسکین و تکمیل کے لئے دوڑ دھوپ میں مصروف و مشغول ہے ہی ——— اصحابِ دانش و بینش کی واضح اکثریت بھی کائنات کی اصل مادّی مان کر ——— اور مادّہ کو حقیقی قرار دے کر 'واقعیت پسندی' (REALISM) کی جانب رُخ کئے ہوئے ہے ——— حتیٰ کہ جنہیں اس سطح سے ذرا بلند ہونے کی توفیق ملی ہے وہ بھی ذہن (MIND) اور رُوح (SOUL) کی "عینیت" یا "ثنویت" کی بحث میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں!

اور آج کا انسان جس فہنی و فکری ژولیدگی اور اخلاقی و عملی پستی کا شکار ہو چکا ہے اُس سے نجات کی واحد راہ اپنی عظمت کی 'بازیافت' اور اپنے مقام

---

[۳] 'نانیت' ——— نان سے یعنی روٹی۔ یا بالفاظ دیگر روٹی، کپڑا اور مکان! ——— یہ الفاظ ہیں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ——— بروایت ڈاکٹر سید اسلم زیدی (قومی ادارہ امراضِ قلب۔ کراچی)

و مرتبہ سے دوبارہ کما حقہٗ آگاہی کے سوا اور کچھ نہیں! ـــــ گویا ع
"علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!" یعنی بقول اقبال ـــــ
"اپنی خودی پہچان او غافل انسان!" ـــــ اور بالفاظِ بیدل:
ع "اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہشیار باش!"

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک 'مرکب' وجود کا حامل ہے ـــــ بقول سعدیؒ:

؎ "آدمی زادہ طُرفہ معجون است — از فرشتہ سرشتہ وز حیواں!"

اس کا ایک جزو "اَحْسَنِ تَقْوِیْم" کا مظہرِ اتم ہے تو دوسرا "اَسْفَلَ سَافِلِیْن" کا مصداقِ کامل![۴]

ایک کا تعلق 'عالمِ امر' سے ہے تو دوسرے کا 'عالمِ خلق' سے![۵]

ایک خاکی ہے تو دوسرا نوری![۶]

ایک 'دنی الطبع' ہے اور ہمہ تن اور ہمہ وقت پستی کی جانب مائل تو دوسرا "قُدسی الاصل" اور ہمیشہ "رفعت پہ نظر" رکھنے والا![۷]

ایک حیوانات کی صف میں ہے ـــــ اور اُن میں سے بھی بہت سوں کے مقابلے میں مختلف اعتبارات سے ہیچ و کمتر اور ضعیف و ناتواں تو دوسرا ملائکہ کا ہم پلّہ ہے بلکہ مقام اور مرتبہ میں اُن سے بھی کہیں اعلیٰ و افضل ـــــ حتّٰی کہ اُن کا مسجود و مخدوم!!

---

[۴] سورۃ التین آیات ۴، ۵ (ترجمہ) "یقیناً ہم نے پیدا کیا انسان کو بہترین ساخت پر پھر لوٹا دیا اُسے نیچے والوں میں سب سے نیچے"

[۵] اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف: ۵۴)

[۶] خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دلِ بے نیاز

[۷] ع "قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے" — اقبال

ایک عبارت ہے اُس کے 'وجودِ حیوانی' سے — تو دوسرا مظہر ہے اُس 'رُوحِ ربانی' کا جو اُس میں پھونکی گئی اور جس کی بنیاد پر وہ مسجودِ ملائک قرار پایا۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی :

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝	(ترجمہ) اور جب میں اسے پوری طرح بناؤں اور اُس میں اپنی رُوح میں سے پھونک دوں تب گر پڑنا اُس کے سامنے سجدے میں!
(الحجر: ۲۹ ، صٓ : ۷۲)	

اب — اصحابِ دانش وبینش میں سے جن کی نظر اپنے وجود کے 'علوی' جزو پر جم کر رہ گئی اور وہ اُس کی عظمت و رفعت کے مشاہدے میں محو ہو کر رہ گئے اُن میں سے کوئی حیران ہو کر پکار اٹھا "سبحانی! ما اعظم شانی!" کسی نے جذب ومستی کے عالم میں نعرہ لگا دیا "انا الحق!!" اور کوئی کیف و سرور سے سرشار ہو کر کہہ بیٹھا "لیس فی جبتی الا اللہ!"[۵] — اور جن کی نگاہِ تحقیق وتفتیش انسان کے وجودِ حیوانی ہی پر مرتکز رہی اور وہ اسی کے بارے میں بحث و تمحیص اور اسی کے متعلق تفحّص و تعمّق میں گُم ہو کر رہ گئے انہیں اس کا تعلق لامحالہ بندروں، بن مانسوں اور گوریلوں ہی سے جوڑتے بنی!!

گویا 'حقیقتِ انسان' کے ضمن میں متذکرۂ صدر متضاد آرا جزوی طور پر اپنی اپنی جگہ صحیح بھی ہیں اور کلی اعتبار سے غلط بھی! اور مسئلۂ زیرِ بحث کا کوئی حل اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان کو دو 'متضاد' اجزاء سے 'مرکب' تسلیم کیا جائے!

---

[۵] منصور حلاج اور اکابر صوفیا کی شطحیات — یعنی وہ جملے جو جذب ومستی کے عالم یعنی حالتِ سُکر میں ان کے منہ سے نکل گئے۔ ان میں سے منصور کو اس لئے دار پر چڑھنا پڑا کہ وہ حالتِ صحو میں بھی اسی موقف پر قائم رہا!

واضح رہے کہ وجودِ انسانی کے یہ دونوں اجزائے ترکیبی ایک دوسرے سے بالکل آزاد اور اپنی اپنی جگہ کامل اور ہر اعتبار سے خود مکتفی ہونے کے باوصف غایت درجہ متصل ہی نہیں باہم دگر پیوست ہیں ـــــــ عہدِ حاضر کی عظیم ترین حماقتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ رُوحِ انسانی کو 'جان' کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے ۔ حالانکہ 'جان' یا 'زندگی' یا 'LIFE' تو انسان کے وجودِ حیوانی کا جزو لاینفک ہے ـــــــ اور رُوحِ انسانی اپنا جُداگانہ اور مستقل بالذّات وجود رکھتے ہوئے اُس وجودِ حیوانی کے ساتھ "وہ اتصالے بے تکیّف بے قیاس[۹]" کے رشتے میں منسلک ہے ـــــــ رُوح کے وجودِ حیوانی کے ساتھ اس اتّصال کے ضمن میں "کہاں" اور "کیسے" کے سوالات ویسے ہی لاینحل ہیں جیسے خود یہ سوال کہ جان اور جسم کا تعلق کس نوعیت کا ہے اور کس عضو سے متعلق ہے ۔ اگرچہ بہت خوب کہا ہے کسی کہنے والے نے کہ

جان نہاں در جسم او در جاں نہاں ... اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں!!

مزید برآں ـــــــ انسان کے یہ دونوں وجود 'دانا' و 'بینا' ہیں ۔ اس کی آنکھیں صرف ظاہری یا حیوانی دیکھنا دیکھتی ہیں ـــــــ اور کان صرف ظاہری یا حیوانی سننا سنتے ہیں اور یہ دونوں حواس ظاہری اپنی حاصل کردہ معلومات (SENSE DATA) کو عقلِ حیوانی یعنی دماغ (BRAIN) کے حوالے کر دیتے ہیں جو ان سے نتائج اخذ کرتا ہے ـــــــ ـــــــ جبکہ رُوحِ انسانی بھی نہ صرف دیکھتی اور سنتی ہے ـــــــ اور اس کا یہ دیکھنا اور سننا ظاہری آنکھوں اور کانوں سے بالکل آزاد ہے[۱۰] ـــــــ بلکہ تعقّل اور تفقّہ بھی کرتی ہے جس کا کوئی تعلّق عقلِ حیوانی یا دماغ سے نہیں ہے ـــــــ رُوح کے آلۂ بصارت و سماعت اور تعقّل و تفقّہ کا نام اصطلاحِ

---

۹ "وہ اتصالے بے تکیّف بے قیاس ـ ہست ربّ النّاس را بہ جانِ ناس" رومی

قرآنی میں 'قلب' ہے - بفحوائے آیاتِ قرآنی :

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ -

(الاعراف : ۱۷۹)

(ترجمہ) ان کے دل ہیں لیکن ان سے سوچتے نہیں، اور انکی آنکھیں ہیں پر ان سے دیکھتے نہیں، اور ان کے کان ہیں مگر ان سے سُنتے نہیں! یہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے!

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ۝ (الحج : ۴۶)

(ترجمہ) تو کیا انہوں نے زمین میں سفر نہیں کیا - پھر اگر ان کے دل (بیدار) ہوتے تو ان سے سوچ بچار کرتے یا ان کے کان ہوتے جن سے سنتے، اس لئے کہ (اصل میں) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں!

یہی نہیں ——— بلکہ وحیٔ جلی اور وحیٔ خفی کے اشارات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ 'قلب'، ——— رُوحِ انسانی کے لئے صرف ذریعۂ سماعت و بصارت اور آلۂ تعقّل و تفقہ ہی نہیں، اس کا 'مسکن' بھی ہے اور اُس کی مثال قندیل کے اس شیشے کی سی ہے جس کے اندر کوئی شمع روشن ہو ———

۱؎ ؎ دم چیست؟ پیام است! شنیدی نشنیدی!
در خاکِ تو یک جلوۂ عام است! ندیدی!!
دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!!

چنانچہ اگر رُوحِ انسانی کو اُس چراغ سے تشبیہ دی جائے جس میں نورِ خداوندی جلوہ فگن ہے تو قلبِ مصفّٰی و مجلّٰی کی مثال اس صاف و شفّاف شیشے کی ہے جو رُوح کے انوار سے اس طرح جگمگا اٹھتا ہے کہ انسان کا پورا وجودِ حیوانی بھی انوارِ الٰہیہ سے منوّر ہو جاتا ہے ـــــ چنانچہ یہی مفہوم ہے اس عظیم تمثیل کا جو سُورۂ نور میں وارد ہوئی ہے :

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ	(ترجمہ) اللہ ہی آسمانوں اور زمین
الارض ط مثل نورہٖ کمشکوٰۃٍ	کا نور ہے - اس کے نور کی مثال
فیھا مصباحٌ ط المصباحُ	(قلبِ مومن میں) یوں ہے جیسے
فی زجاجۃٍ ط الزجاجۃُ	ایک طاق ہو جس میں ایک دیا ہو،
کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ	وہ دیا ایک شیشے میں ہو، (اور)
(النور : ۳۵)	وہ شیشہ ایسے ہو جیسے ایک چمکتا ستارا!

(اس آیۂ مبارکہ کے ضمن میں بالکل صحیح ہے وہ رائے جو اکثر متقدّمین نے دی ہے کہ "مَثَلُ نُوْرِہٖ" کے بعد "فی قلب المومن" کے الفاظ مقدّر و محذوف ہیں!)

اس کے برعکس اگر شیشۂ قلب فسق و فجور کی کثرت، خواہشات کی پرستش اور شہوات کے اتّباع کے باعث داغدار اور مکدّر ہو جاتا ہے تو رُوح کے انوار کے انسان کے وجودِ حیوانی میں سرایت کرنے میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور اس کیفیت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اُس طور سے جس کی وضاحت وحیٔ خفی یعنی اس حدیث نبوی (صلّی اللہ علیہ وسلّم) میں ملتی ہے[۱] ـــــ :

إن المومن اذا اذنب کانت	(ترجمہ) مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے
نکتۃ سوداء فی قلبہٖ	تو اس کے دل پر ایک سیاہ داغ پڑ

[۱] رواہ احمدؒ والترمذیؒ وابن ماجہؒ عن ابی ہریرۃؓ وقال الترمذیؒ : ہذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ

فان تاب واستغفر صُقل قلبہ وان زاد زادت حتی تعلو قلبہ فذٰلک الرّان الّذی ذکر اللہ تعالٰی "کلّا بل ران علٰی قلوبھم ما کانوا یکسبون"

جاتا ہے۔ پھر اگر توبہ و استغفار کرتا ہے تو دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر اور گناہ کرتا ہے تو دل کی سیاہی بھی بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ پورے دل پر چھا جاتی ہے چنانچہ یہی ہے وہ دلوں کا زنگ جس کا ذکر اللہ نے اس آیۂ مبارکہ میں فرمایا ہے

(سورۂ مطففین : ۱۴) "نہیں، بلکہ زنگ لگ گیا ہے اُن کے دلوں پر ان کے اعمال کے سبب سے!"

اور اس عمل (PHENOMENON) کی یہی وہ منطقی انتہا ہے جسے "وحیٔ جلی" میں ختمِ قلوب اور طبعِ قلوب سے تعبیر فرمایا گیا ——— بفحوائے الفاظِ قرآنی:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

(البقرۃ : ۷)

(ترجمہ) اللہ نے مُہر کردی ہے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے لئے بہت بڑی سزا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

(النحل : ۱۰۸)

(ترجمہ) یہی ہیں وہ لوگ جن کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے اور یہی ہیں (حقائق و معارف سے) غافل و بے خبر!

اور یہی وہ کیفیت ہے جسے قرآن انسان کی "رُوحانی موت" سے تعبیر فرماتا

ہے۔ اس لیے کہ اس حال میں انسان کے وجود حیوانی کا اُس روحِ ربانی سے تعلق بالکل منقطع ہو جاتا ہے جس نے اُسے شرفِ انسانیت عطا فرمایا تھا۔ اور اُس کا نہاں خانۂ قلب رُوح کی قبر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ نتیجۃً انسان کی صورت میں ایک دو ٹانگوں پر چلنے والا چوپایہ باقی رہ جاتا ہے جو حقیقتِ انسان، کے اعتبار سے ایک چلتے پھرتے مقبرے اور متحرک ' تعزیے ' کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ——— اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ !!

چنانچہ ایسے ہی حقیقت کے اعتبار سے مُردہ اور ظاہری اعتبار سے زندہ انسانوں کا ذکر ہے ان آیاتِ قرآنیہ میں :

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى (النمل : ۸۰)	(ترجمہ) (اے نبیؐ) آپ نہیں سنا سکتے ان مُردوں کو !
فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۤءَ (الروم : ۵۲)	(ترجمہ) تو (اے نبیؐ!) آپ نہ ان مُردوں کو سُنا سکتے ہیں اور نہ ان بہروں تک اپنی دعوت پہنچا سکتے ہیں !

جنہیں بعض لوگ خواہ مخواہ گھسیٹ لے جاتے ہیں ' سماعِ موتیٰ ' کے ایک اختلافی مسئلے پر بحث مباحثے میں !

الغرض ! جب تک کوئی شخص انسانی شخصیت کے ان دو متضاد اجزائے ترکیبی کو نہ جان لے وہ دین و مذہب کے لطیف تر حقائق اور وحیٔ آسمانی میں وارد شدہ معارف وحِکَم کا کماحقہٗ ادراک نہ کر سکے گا۔ اور بایں محرومی و تہی دستی اگر مقامِ دعوت، پر فائز ہو جائے گا تو اس کی تمام تر گفتگو احکامِ شریعت اور نظامِ اسلام کے بارے میں ہو گی حقائقِ ایمانی کا تذکرہ ہو گا بھی تو بس سرسری سا ——— اور اگر شارح و مفسرِ قرآن

بن بیٹھے گا تو لغت و نحو کے اشکالات، معنی و بیان کے لطائف اور فصاحت و بلاغت کے نوادرات سے تو خوب بحث کرے گا لیکن فلسفہ و حکمتِ دین کے لطیف و غامض نکات اُس کی نگاہ سے اوجھل رہ جائیں گے اور حقائق و معارفِ ایمانی کے اعتبار سے اہم ترین مقامات سے وہ ایسے گذر جائیگا جیسے وہاں کوئی لائقِ توجہ بات ہے ہی نہیں!

(جاری ہے)

انجمن خدام القرآن اور قرآن اکیڈمی

کے مقاصد کی وضاحت کے لئے مطالعہ فرمائیں

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

از قلم :— ڈاکٹر اسرار احمد

ملنے کا پتہ : ۳۶ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

اسلام میں عورت کی گواہی

اعتراضات اور جوابات

محمد رفیق چوہدری

ہمارے ملک میں حکومت کی جانب سے موجودہ قانون سازی کی مہم میں ایک اہم بحث عورت کی شہادت کا مسئلہ ہے۔ جہاں تک اسلامی قانون میں عورت کی شہادت کا تعلق ہے تو اس بارے میں قرآن و سنت کے واضح احکام موجود ہیں کہ مالی معاملات میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر تسلیم کیا گیا ہے۔ گویا تمام مالی معاملات میں ایک عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف شمار ہوتی ہے۔

قرآن میں عورت کی گواہی

قرآن حکیم میں صریح طور پر عورت کی شہادت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے:

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ	اور اس پر اپنے لوگوں میں سے دو
مِنْ رِّجَالِكُمْ فَإِنْ لَّمْ	مردوں کو گواہ ٹھہرا لو، پھر اگر دو
يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ	مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو
امْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ	عورتیں ہوں۔ یہ گواہ تمہاری
مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ	پسند کے ہوں۔ دو عورتیں اس
إِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ	لئے کہ ایک بھول جائے تو دوسری
إِحْدٰهُمَا الْأُخْرٰى۔	یاد دلائے۔

(البقرہ آیت ۲۸۲)

سیاقِ کلام میں آیت بالا کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو مالی معاملات میں یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ جب کبھی آپس میں قرض کا کوئی لین دین کریں تو ایسے معاملے

کا ایک تو تحریر میں لایا جانا ضروری ہے اور دوسرے یہ کہ قرض کی ایسی دستاویز پر شہادت قائم ہونی ضروری ہے۔ یہ گواہی دو مردوں کی گواہی ہوگی اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ گواہ عادل ہونے چاہئیں۔ جس کی طرف واضح اشارہ آیت کے الفاظ "مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ" (یہ گواہ تمہاری پسند کے ہوں) میں موجود ہے۔ پھر آخر میں اللہ تعالیٰ نے ایک مرد کی بجائے دو عورتوں کو گواہ بنانے کی علت و حکمت یہ بیان فرمائی کہ "ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلائے"۔

اس آیت سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ تمام مالی معاملات میں شہادت کا نصاب تو دو مرد ہیں یا پھر ایک مرد اور دو عورتیں ہیں۔

اُمّت کے تمام فقہاء اور مفسّرین اسی مفہوم پر متفق ہیں اور اس مفہوم سے کسی نے اختلاف نہیں کیا ہے۔

حدیث میں عورت کی گواہی

جہاں تک حدیث میں عورت کی گواہی کا تعلق ہے تو اس بارے میں صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ:

فشهادة امرأتين	دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی
تعدل شهادة رجل۔	گواہی کے برابر ہے۔

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، ج اوّل، ص ۶۱)

اسی مفہوم کی دیگر احادیث صحیح بخاری، کتاب الحیض میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے، ترمذی، ابواب الایمان میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے، ابوداؤد، کتاب السنۃ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے اور مسند احمد بن حنبل میں بھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کی روایت سے، موجود ہیں۔

گویا قرآن و سنت کے صریح احکام کے مطابق دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے یا دوسرے الفاظ میں عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف ہے۔

فقہاء اسلام اور عورت کی گواہی

قرآن وسنت کے واضح احکامات کے مطابق فقہا ر اسلام نے مالی معاملات میں دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر قرار دیا ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ ابن رشد نے اپنی کتاب "بدایۃ المجتہد" میں ائمۃ اربعہ کا یہی مذہب نقل کیا ہے:

واتفقوا علی انّہ تثبت الأموال بشاهد عدل وامرأتین لقوله تعالیٰ "فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ"	اس پر اتفاق ہے کہ مالی معاملات میں ایک عادل مرد اور دو (عادل) عورتوں کی گواہی معتبر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق کہ "پھر ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہوں جن کی گواہی تمہیں پسند ہو"۔

(بدایۃ المجتہد ج ۲، ص ۴۶۵ مطبوعہ مصر ۱۹۶۰ء)

اس بات پر بھی فقہائے کرام کا اتفاق ہے کہ حدود و قصاص کے مقدمات میں عورت کی شہادت معتبر نہیں ہے۔

عورت کی نصف گواہی پر کئے گئے اعتراضات کے جوابات

موجودہ حکومت کی جانب سے مجوزہ "اسلامی قانون شہادت" کی تدوین کے دوران میں اور اب اس کے نفاذ پر بعض لوگوں بالخصوص چند مغرب زدہ خواتین نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ اس گروہ کا موقف یہ ہے کہ ہر معاملے میں مرد کی طرح عورت بھی گواہ بن سکتی ہے اور اس کی گواہی ہر حال میں مرد کی گواہی کے برابر تسلیم کی جانی چاہیئے اس سلسلے میں عورت کی نصف گواہی کے خلاف جو اعتراضات اس گروہ نے اٹھائے ہیں۔ ذیل میں ہم ان کے تمام اعتراضات نقل کر کے ان کے جوابات دیتے ہیں۔

اعتراض ۱: مرد اور عورت دونوں ہی انسانیت میں برابر ہیں۔ دونوں ہی یکساں طور پر احترام کے مستحق ہیں لہٰذا ان کی معاشرتی ذمہ داریوں اور سماجی سرگرمیوں میں بھی کسی قسم کی عدم مساوات نہیں ہونی چاہیئے اور دونوں کو زندگی کے تمام معاملات میں "شانہ بشانہ" حصہ لینا چاہیئے۔ بنا بریں، عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی کا نصف قرار دینا دراصل عورت کی تذلیل کرنا ہے۔ اُسے مرتبۂ انسانیت سے گرانا ہے اور اُسے حقیر سمجھنا ہے اور یہ سب کچھ اسلام کے بھی خلاف ہے کیونکہ وہ ہمیں مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔

جواب: اس حقیقت سے کوئی معقول آدمی انکار نہیں کرسکتا کہ شرفِ انسانیت میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں دونوں یکساں طور پر انسان ہیں اور اسلام میں جس طرح مرد کا احترام ہے اُسی طرح عورت کا بھی احترام ہے۔ لیکن ان دونوں کے شرفِ انسانیت میں برابر ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ دونوں کی معاشرتی سرگرمیاں اور سماجی ذمہ داریاں بھی ایک جیسی ہوں اور ان میں کوئی فرق نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کو مختلف جسمانی صلاحیتوں اور مزاجی خصوصیتوں سے نوازا ہے۔ ایک کو "صنفِ نازک" بنایا ہے تو دوسرے کو "صنفِ سخت"۔ ایک کو نسوانیت کا پیکر بنایا ہے تو دوسرے کو مردانگی کا جوہر عطا کیا ہے۔ اسی فطری اختلاف کی بدولت "یکساں طور پر انسان ہونے کے باوصف" دونوں فریق معاشرے میں الگ الگ ذمہ داریاں رکھتے ہیں، دونوں کے حقوق و فرائض مختلف ہوگئے ہیں۔ اور دونوں کا دائرۂ عمل جُدا جُدا ہو گیا ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس نے مرد اور عورت کے اسی اختلافِ صلاحیت و عمل کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ مرد کو خاندان کا سربراہ بنایا گیا ہے۔ اُس پر پورے خاندان کی نگرانی اور معاشی کفالت کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے اور ایک مرد کی صلاحیتیں اسی کی متقاضی ہیں کہ اسے خاندانی زندگی میں یہی مقام دیا جائے۔ اس کے برعکس ایک عورت کو (خواہ وہ بیٹی ہو، بہن ہو، بیوی ہو یا ماں ہو) معاشی جدوجُہد سے فارغ کرکے امورِ خانہ سرانجام دینے اور بچوں کی پرورش و نگہداشت کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اور ایک عورت ہی ان تمام معاملات کو صحیح طور

پر سرانجام دے سکتی ہے اُس کی فطری صلاحیتیں بھی اسی امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ معاشرتی زندگی میں اُسے یہی منصب عطا ہو[1]۔ یہ ایک فطری نظام ہے اور اس میں صلاحیت و عمل کا اختلاف کسی فرد کے بارے میں بھی احساسِ کمتری پیدا نہیں کرتا، نہ ہی اُسے حقیر جانتا ہے اور نہ ہی انسانی ترقی کے منافی ہے۔ اسلام کے واضح اور صریح احکامات سے یہی تقسیمِ عمل ثابت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص دینِ اسلام کے ان واضح احکام کو نہیں ماننا چاہتا تو اُسے چاہیئے کہ وہ اخلاقی جرأت سے کام لے اور اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کرے۔ اسلام کا نام لے کر اُس کے خلاف عملاً بغاوت کرنا ایک سنگین جُرم ہے۔ اور کسی مسلمان کے لئے یہ طرزِ عمل مناسب نہیں ہے۔

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا	کسی مومن مرد اور کسی مومنہ
مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ	عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب
وَرَسُولُهٗٓ أَمْرًا أَنْ	اللہ اور اس کا رسُول کسی معاملے
يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ	کا فیصلہ کر دیں تو اس کے بعد اُن
أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ	کے لئے اس معاملے میں کوئی اختیار
وَرَسُولَهٗ فَقَدْ ضَلَّ	باقی رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے
ضَلٰلًا بَعِيدًا۔	رسول کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ کھُلی
(الاحزاب ۳۶)	گمراہی میں ہے۔

اب اگر قرآن و سنّت میں ایک عورت کی گواہی مرد کی گواہی سے نصف قرار دی گئی ہے تو یہ ایک ایسا حکم ہے جس سے کسی مسلمان کے لئے خواہ وہ مرد ہو یا عورت انکار

---

[1] ممکن ہے بعض خاص حالات میں ایک عورت ہی کسی خاندان کی معاشی طور پر کفیل ہو اور کوئی مرد بطور کفیل نہ ہو۔ مگر یہ ایک استثنائی صورت ہے یہ اسلامی معاشرے کا عام قاعدہ نہیں ہے اور مستثنیات پر عام قوانین کا اطلاق نہیں ہوا کرتا۔ اُن کا معاملہ بالکل الگ ہے اور اُس کا حل بھی دوسرا ہے۔

کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس حکم کی حکمت خواہ ہماری محدود اور ناقص عقل کی سمجھ میں نہ آئے، خواہ یہ حکم ہماری خواہشِ نفس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، بہرحال تسلیم کرنا ہوگا۔

۲ - دوسرا اعتراض یہ ہے کہ عورت کی نصف گواہی اسلام کے ابتدائی دور کے لئے تھی۔ اس وقت کی عورت اتنی باشعور اور ترقی یافتہ نہ تھی اب حالات کے تغیر سے وہ باشعور اور ترقی یافتہ ہوگئی ہے۔ حالات کے تغیر سے احکام بدل جاتے ہیں لہٰذا اب اجتہاد کے ذریعے عورت کی پوری گواہی کو شرعی طور پر تسلیم کر لینا چاہیئے تاکہ حالات کی تبدیلی کے لحاظ سے اسلام کا صحیح منشأ پورا ہو سکے۔

جواب : جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حالات بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں تو اس بارے میں فقہائے اسلام کا یہ متفقہ اصول ہے کہ یہ تبدیلی قرآن و سنت کے واضح اور منصوص احکام میں نہیں ہو سکتی۔ منصوص احکام ناقابلِ تغیر ہیں۔ تبدیلی صرف فقہ کے ایک مخصوص دائرے میں ہو سکتی ہے جس کا تعلق لوگوں کے مصالح اور عرف وغیرہ سے ہو۔ مثال کے طور پر روزانہ پانچ نمازیں فرض ہیں یہ کم و بیش نہیں ہو سکتیں۔ ماہِ رمضان کے روزے فرض ہیں ان کی تعداد گھٹائی یا بڑھائی نہیں جا سکتی۔ زکوٰۃ کی شرح اور نصاب مقرر ہیں، ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تبدیلی کا تعلق فقہی اجتہادات سے ہے مثلاً ایک زمانے میں کوئی اسلامی حکومت دائرۂ شریعت کے اندر رہتے ہوئے زکوٰۃ جمع کرنے اور اُسے صرف کرنے کا ایک عملی طریقِ کار وضع کرتی ہے۔ یہ عملی طریقِ کار حالات کے تغیر سے بدلا جا سکتا ہے، کسی اور زمانے کی اسلامی حکومت کوئی نیا عملی طریقِ کار بنا کر اُس پر عمل پیرا ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ نظامِ زکوٰۃ کا عملی طریقِ کار منصوص نہیں ہے لہٰذا اسے حالات کے مطابق بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن جو امر منصوص ہوگا اُس میں تبدیلی کا امکان نہ ہوگا۔

اب جہاں تک عورت کی نصف گواہی کا معاملہ ہے تو یہ ایک امر منصوص ہے اور قرآن و سنت کے واضح احکامات سے ثابت ہے۔ یہ کوئی اجتہادی یا انتظامی معاملہ نہیں ہے کہ اس میں تغیر ممکن ہو۔ لہٰذا عورت کی نصف گواہی کا حکم تا قیامت قائم رہے گا۔

البتہ جو لوگ قرآن وسنت کے واضح اور صریح احکام کو اپنی خواہشِ نفس کے تابع رکھ کر یا حالات کے دباؤ میں آکر انہیں موم کی ناک بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں کہ جس طرح چاہیں جب چاہیں ان کو بدل کر رکھ دیں تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کے اس ارادے میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دے گا۔

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ — بلاشبہ مجرم لوگ فلاح نہیں پا سکتے۔ (یونس ۱۷)

۳ - اس سلسلے کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ موجودہ قانون شہادت میں عورت کو گواہی کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے - اور اب وہ اس حق تلفی کی وجہ سے بجا طور پر احتجاج کر رہی ہے -

جواب : گواہی دینا سرے سے کوئی حق (RIGHT) نہیں ہے جس کے تلف ہونے پر کوئی شخص مضطرب ہو - عدالتی شہادت تو مردوں کا بھی حق نہیں ہے بلکہ یہ ایک فرض (DUTY) ہے جو عائد کیا گیا ہے - دنیا کے کسی مذہب اور قانون نے گواہی کو حق تسلیم نہیں کیا ہے - بلکہ اسے ایک ذمہ داری قرار دیا ہے - تعجب ہے کہ آج کی بعض خواتین (جن کو مرد نما خواتین کہنا زیادہ مناسب ہے) سڑکوں پر جلوس نکال کر یہ احتجاج کرتی پھرتی ہیں کہ اُن کو اُن کے "حق" سے محروم کر دیا گیا ہے - حالانکہ وہ اگر غور فرمائیں تو اُن کے معاملے کی یہ صورت ہے کہ :

وہ پکار پکار کر یہ کہہ رہی ہیں کہ قانون اُن پر گواہی کی ذمہ داری کیوں عائد نہیں کرتا ہے کیوں نہیں اُن پر گواہی کی ذمہ داری کا بوجھ ڈالا جاتا ہے ع

نا طقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے

اسلام نے اگر صنفِ نازک پر ادائے شہادت کی بھاری ذمہ داری نہیں ڈالی تھی تو یہ اُس کا عورت پر احسانِ عظیم تھا کہ ایک جانِ ناتواں کو اس بارِ گراں سے سبکدوش رکھا گیا - شہادت دینا کوئی انسانی حق (HUMAN RIGHT) نہیں تھا، جسے عورت سے چھین لیا گیا ہو اور جس کی محرومی پر اُسے واویلا کرنا چاہیئے تھا - بلکہ یہ تو ایک فریضہ ہے جسے اوّل تو اسلام نے عورت پر عائد ہی نہیں کیا اور اگر کبھی کیا بھی ہے تو اس کے ساتھ ایک اور گواہ عورت کا سہارا بھی دے دیا ہے - مگر شاید یہ بھی دانشِ

نسوانی کی بوالعجبیوں میں سے ہے کہ وہ کسی حق کی محرومی پر نہیں بلکہ ایک ذمہ داری کے اُس پر عائد نہ کئے جانے پر آج سراپا احتجاج بنی ہوتی ہے - ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

۴ - چوتھا اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کی آیتِ دین (۲۸۲) میں جہاں مرد اور عورت کی گواہی کا ذکر آیا ہے وہاں ایک مرد کی بجائے دو عورتوں کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ "ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے" گویا اصل میں گواہ تو ایک ہی عورت ہوگی، دوسری عورت صرف مذکرہ یاد دہانی کرانے والی (REMINDER) ہوگی - لہذا عورت کی گواہی از روئے قرآن مرد کی گواہی کے بالکل برابر ہے اُس کا نصف نہیں ہے -

جواب : یہ ایک سطحی اعتراض ہے جو صرف عربیت اور قرآن فہمی دونوں سے عاری ذہن ہی میں پیدا ہو سکتا ہے - اس کا مبدأ قرآن کے اُردو یا انگریزی تراجم کے حوالے سے قرآن کے قانون کو سمجھنے کی عادت ہے - اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ زیرِ بحث میں گواہی کے دو نصاب مقرر فرمائے ہیں - ایک یہ کہ قرض کے معاملے میں دو مرد بطور گواہ ہونے چاہئیں اور آیت کے الفاظ "وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ" (اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ بنالو) میں یہی نصاب مذکور ہوا ہے - دوسرا نصابِ شہادت یہ بیان ہوا ہے کہ :

فَإِنْ لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ — پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد
فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ - — دو عورتیں ہوں -

یعنی ایک مرد اور دو عورتیں - گویا ایک مرد کی بجائے دو عورتیں گواہ بنائی جائیں - دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہوگی یا ایک عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف ہے - دوسرے نصاب کی رُو سے دونوں عورتیں گواہ ہوں گی - قرآن نے شہادت کے یہی دو نصاب بیان فرمائے ہیں -

تمام مفسرین کے نزدیک قرآن میں شہادت کے یہی دو نصاب بیان ہوئے ہیں اور یہ بات کہ دوسرے نصاب کی رُو سے دونوں عورتیں بطور گواہ ہونگی، خود قرآن مجید کے متن اور کتبِ تفاسیر کی تصریحات سے بالکل واضح ہیں - مثال کے طور پر ہم یہاں پر چند

حوالے نقل کریں گے ۔

(ا) "احکام القرآن" میں ابن عربیؒ تحریر فرماتے ہیں :

فاذا کانت امرأتان و	جب دو عورتیں ہوں گی اور ایک
ذکّرت احداھما الأخری	دوسری کو یاد دلا دے گی تو ان
کانت شھادتھما شھادۃ	دونوں عورتوں کی شہادت ایک
رجل واحد ، کالرجل	مرد کی شہادت کے برابر ہو جائیگی
یستذکر فی نفسہ	جیسے کوئی مرد اپنے حافظے پر زور
فیتذکّر۔	دے کر کوئی بات دوبارہ یاد کر لیتا
(احکام القرآن ، ج ۱ ، ص ۲۵۵)	ہے ۔

(ب) تفسیر "معارف القرآن" میں مولانا محمد ادریس کاندھلوی اسی آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

"اور اگر گواہی کے لئے دو مرد میسّر نہ آئیں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں گواہی کے لئے کافی ہیں بشرطیکہ یہ سب ان لوگوں میں سے ہوں جن کو تم گواہ بنانے کے لئے پسند کرتے ہو۔ یعنی ثقہ اور امین ہوں، فسق و فجور اور بے مروتی سے متہم نہ ہوں اور نہ دونوں میں کوئی ایسی قرابت ہو کہ جو شبہ اور تہمت کا باعث ہو۔ اور ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کا ہونا اس لئے شرط کیا گیا کہ شاید ایک عورت اپنی فطرت غفلت اور ذاتی قصورِ عقلی کی وجہ سے واقعۂ شہادت کے کسی جزء کو بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلائے اور اس طرح شہادت کا مضمون مکمل ہو جائے"

(معارف القرآن از مولانا محمد ادریس کاندھلوی ، ج اوّل، ص ۴۲۵)

(ج) تفسیر "تدبّرِ قرآن" میں مولانا امین احسن اصلاحی اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں :

"اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسّر نہ آسکیں تو اس کے لئے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے ۔ دو عورتوں کی شرط اس لئے ہے کہ اگر ایک سے کسی لغزش کا صدور ہو گا تو دوسری کی تذکیر و تنبیہ سے اس کا سدِّباب ہو سکے گا ۔ یہ فرق عورت کی تحقیر کے پہلو سے نہیں ہے بلکہ اس کی مزاجی خصوصیات اور اس کے

حالات و مشاغل کے لحاظ سے یہ ذمہ داری اس کے لئے ایک بھاری ذمہ داری ہے اس وجہ سے شریعت نے اس کے اٹھانے میں اس کے لئے سہارے کا بھی انتظام فرمادیا ہے"۔
(تدبر قرآن، ج اول، ص ۵۹۰)

اسی ضمن میں ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ بالفرض دو عورتوں میں سے کسی ایک کا شاہدہ (گواہ) ہونا اور دوسری کا مذکّرہ (یاد دہانی کرانے والی) ہونا کیسے طے ہوگا؟ کیونکہ قرآنی عبارت کی رُو سے دونوں ہی شاہدا اور دونوں ہی مذکّرہ ہوسکتی ہیں۔ بلکہ قرآن کے الفاظ میں تو بھُول نے والی شاہدہ ہی کو مذکّرہ کہا گیا ہے۔ لہٰذا کسی ایک کو شاہدہ (گواہ) اور دوسری کو مذکّرہ ٹھہرانا خود قرآن کے الفاظ اور مفہوم دونوں کے خلاف ہے۔

(۵) پانچواں اعتراض یہ ہے کہ 'لعان' کی صورت میں بھی عورت اور مرد کی گواہی کو برابر تسلیم کیا گیا ہے اور قرآن میں اس کے لئے لفظِ 'شہادت' آیا ہے۔ لہٰذا عورت اور مرد کی گواہی برابر ہے اور ان میں کوئی فرق کرنا روا نہیں ہے۔

جواب: ہمارے نزدیک لعان کو شہادت قرار دینا اصولی طور پر غلط ہے اور یہ قیاس مع الفارق ہے کہ لعان کی بنیاد پر عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی کے برابر ٹھہرایا جائے۔ اس بارے میں درج ذیل دلائل دیئے جاتے ہیں۔

الف۔ حدیث اور فقہ کی تمام کتابوں میں لعان اور شہادت کے الگ الگ ابواب آتے ہیں اور کہیں بھی ان کو ایک نہیں سمجھا گیا بلکہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے مختلف امر سمجھکر جُدا جدا بیان کیا گیا ہے۔

ب۔ حضرت ماعز اسلمی کے رجم سے متعلق احادیث میں بھی شہادت کا لفظ آیا ہے مگر یہ اصطلاحی شہادت کے معنوں میں نہیں ہے بلکہ اقرار، حلف بالیمین اور اقبالِ جرم کے معنوں میں ہے اور عربی زبان میں شہادت کا لفظ ان معنوں میں بھی آتا ہے۔ صحیح بخاری کے الفاظ

"فشهد على نفسه اربع شهادات" (پھر اُس نے (حضرت ماعز نے) چار مرتبہ اپنے خلاف قسم کھائی (کہ اُس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔)

فقہاءِ اسلام نے حضرت ماعز کی اس "شہادت"، "شہادات" کو اصطلاحی "شہادت"، نہیں مانا ہے بلکہ "حلفیہ اقرارِ جرم" تسلیم کیا ہے - لہذا محض لفظِ شہادت کے استعمال سے وہ قانونی اور اصطلاحی شہادت مُراد نہیں لی جا سکتی جو کسی مقدمے میں مدّعی اور مدعا علیہ کے علاوہ ایک تیسرا شخص ثبوتِ دعوٰی یا خلافِ دعوٰی گواہی دیتا ہے -

ج - امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الاُمّ" میں لعان کو شہادت کی بجائے یمین قرار دیا ہے - وہ لکھتے ہیں -

"الشهادة هنا يمين"	(لعان میں، شہادت سے مراد یمین (اپنے بارے میں حلفیہ بیان) ہے -
(کتاب الاُمّ، ج ۵، ص ۱۳۴)	

د - احکام القرآن میں ابن عربیؒ تحریر کرتے ہیں کہ :

والفيصل في أنها يمين، لا شهادة -	دوٹوک بات یہی ہے کہ یہ (لعان) یمین (اپنے بارے میں حلفیہ بیان) ہے شہادت نہیں ہے -
(احکام القرآن، ج ۳، ص ۱۳۴۴)	

۶ - چھٹا اعتراض یہ ہے کہ ایک عورت کا بیان اگر حدیث کی روایت کرنے میں معتبر ہے تو مقدمات میں اُس کا قول کیوں غیر معتبر یا نصف ہو - مثال کے طور پر اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ سے بکثرت احادیث مروی ہیں اور اُمت نے آپ کو ثقہ اور عادل راویہ تسلیم کیا ہے - تو کیا مقدمات میں حضرت عائشہؓ کی گواہی معتبر نہ تھی یا نصف قرار دی گئی تھی ؟

جواب : ادائے شہادت اور روایتِ حدیث کو ایک سمجھنا بنیادی طور پر صحیح نہیں ہے - یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں اور ان کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا غلط ہے ان دونوں کا مختلف ہونا درج ذیل شواہد سے واضح ہو جاتا ہے -

ل - حدیث اور روایت میں خبرِ واحد بھی معتبر اور حجت ہوتی ہے - ایک آدمی خواہ وہ مرد ہو یا عورت، صحابی ہو یا غیر صحابی اگر وہ ثقہ اور عادل ہونے کی اہلیت رکھتا ہو تو اُس کی روایت قبول کی جاتی ہے لیکن اگر وہی راوی کسی ایسے مقدمے میں تنہا

گواہ بن کر کسی قاضی کے سامنے جاتا ہے جس میں دو یا چار گواہوں کا نصاب ضروری ہے تو باوجود اُس راوی کی ثقاہت و عدالت کے قاضی اُس کی تنہا گواہی پر کسی ملزم کو نہ تو مجرم قرار دے سکتا ہے اور نہ ہی اُسے سزا دینے کا مجاز ہے ۔

تاریخ الخلفاء میں علّامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کی ایک زرہ اپنے عہدِ خلافت میں گم ہو گئی، اتفاق سے وہی زرہ آپ نے ایک یہودی کے پاس دیکھ لی اور پھر عدالت میں اُس کے خلاف دعویٰ دائر کیا ۔ اس پر قاضی شریح نے حضرت علیؓ سے ثبوت طلب کرتے ہوئے دریافت کیا :

أَلَكَ بَيِّنَةٌ يا امير المؤمنين۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۸۵)	امیر المؤمنین! کیا آپ کے پاس اس (دعوے) کا کوئی ثبوت ہے؟ (کہ یہ زرہ اسی یہودی نے چرائی ہے)

سوال یہ ہے کہ کیا حضرت علیؓ اگر کوئی حدیث بیان فرماتے تو پھر بھی آپ سے کوئی شخص یہ پوچھ سکتا تھا کہ "جناب! اس حدیث کا ثبوت لائیے، ورنہ آپ کی روایت کردہ حدیث کو قبول نہیں کیا جا سکتا"؟ یہ تو صرف مقدمات میں ہے کہ ایک قاضیٔ عدالت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مطابق کہ :

البینة علی المدعی	مدّعی پر بارِ ثبوت ہے ۔

بڑے سے بڑے صحابی سے بھی اُس کے دعوٰی کے حق میں ثبوت طلب کر سکتا ہے ۔ جبکہ روایتِ حدیث کا معاملہ یہ ہے کہ محدثین کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ:

الصحابة کلّھم عدول۔	تمام صحابہ (روایت میں) عادل ہیں ۔

اور کسی صحابی پر روایتِ حدیث کے باب میں کوئی جرح نہیں ہو سکتی ۔ یہ اسلامی قانون ہے کہ کسی ایک صحابی یا تابعی کی شہادت پر نہ کسی ملزم پر حدِّ قذف جاری کی جا سکتی ہے نہ اُس پر حدِّ زنا قائم ہو سکتی ہے اور نہ ہی اُسے رجم کیا جا سکتا ہے ۔ بلکہ اس کے لئے چار صحابی یا چار تابعی یا چار دوسرے عادل گواہوں کی شہادت درکار ہے اس کے بغیر حدّ کا نفاذ نہیں ہو سکتا ۔ لہٰذا یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ روایتِ حدیث اور چیز ہے اور ادائے شہادت

اور چیز ہے۔

(ب) روایتِ حدیث میں یہ بات نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہوتی ہے کہ ایک راوی یہ بتائے کہ "اخبرنا فلان عن فلان" (میں نے یہ حدیث فلاں سے سُنی ہے) اور اُس نے فلاں سے سُنی ہے)۔ یہاں محض سماع بلکہ صحیح تر لفظوں میں "سماع علی السماع" بھی نہ صرف یہ کہ معتبر ہے بلکہ صحتِ حدیث کا ضامن ہے۔ لیکن کیا اسی سماع یا سماع علی السماع کو کوئی عدالت بھی بطور شہادت قبول کر سکتی ہے۔ جبکہ فقہائے اسلام کا اس امر میں اتفاق ہے کہ تمام مقدمات میں سماعی شہادت کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور ادائے شہادت کے لئے ضروری ہے کہ واقعہ کا چشم دید گواہ موجود ہو ورنہ محض سُنی سنائی شہادت ہرگز معتبر نہیں ہے۔

لہٰذا روایتِ حدیث اور عدالتی شہادت کو ایک سمجھنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ اور اسکی بنیاد پر عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی کے برابر ٹھہرانا قیاس مع الفارق ہے۔

۷۔ اس سلسلے کا ساتواں اعتراض یہ ہے کہ اگر عورتوں کو مختلف مقدمات میں گواہ بننے سے روک دیا جائے۔ یا اُن کی گواہی کو آدھی گواہی مانا جائے تو یہ امر معاشرے میں جرائم کے اضافے کا موجب ہوگا۔

جواب : یہ ایک غلط فہمی ہے جو اسلام کے نظامِ قانون و عدالت کے بارے میں بے اعتمادی کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر فی الواقع ہمارے معاشرے میں اسلامی حدود و تعزیرات کو لفظاً و معناً (In letter & spirit) پورے خلوص کے ساتھ نافذ کیا جائے اور صرف مردوں کی شہادت ہی کو تسلیم کر لیا جائے تو ہم پورے وثوق سے یہ دعوے کرتے ہیں کہ اسلام کی عبرتناک سزاؤں کی بدولت صرف ایک سال کے اندر اندر جرائم کا تقریباً خاتمہ ہو سکتا ہے۔

اس دنیا میں سعودی عرب اور امریکہ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے ایک ملک میں عورت کی عدمِ شہادت یا نصفِ شہادت ہے اور جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ دوسرے ملک میں عورت کی پوری شہادت ہے مگر وہاں جرائم کی شرح خوفناک حد تک بڑھ چکی ہے۔

سلسلہ تقاریر الٓمّٓ

سُورۂ سجدہ

ڈاکٹر اسرار احمد

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓمّٓ ۝ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝
أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ لِتُنْذِرَ
قَوْمًا مَا أَتَاهُمْ مِنْ نَذِيرٍ مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۝

صدق اللہ العظیم

السلام علیکم! نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد:

سُورۃ لقمان کے بعد قرآن حکیم میں سورہ سجدہ آتی ہے۔ جس کا ایک نام "سورۃ الٓمٓ السجدہ" بھی ہے۔ اس لئے کہ سورہ سجدہ قرآن مجید میں حٰمٓ سیریز میں بھی آتی ہے اس سے ممیز کرنے کے لئے اُسے حٰمٓ السجدہ اور اِسے الٓمٓ السجدہ کا نام دیا گیا ہے۔ البتہ اگر صرف سُورہ سجدہ کہا جائے تو اس سے مراد یہ سورہ ہو گی جس کے بارے میں آج گفتگو ہو رہی ہے۔

یہ سورۃ مبارکہ ۳۰ آیات اور ۳ رکوعوں پر مشتمل ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یوں تو پورے ہی قرآن مجید سے نہایت شدید محبت تھی۔ لیکن بعض سورتوں سے آپؐ کو ایک خصوصی تعلق خاطر تھا۔ ان میں سے ایک سورہ یہ سورۃ سجدہ بھی ہے چنانچہ آپؐ کے رات کے معمولات میں روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات شامل تھی کہ سونے سے قبل آپؐ یہ سورۃ مبارکہ اور سورۃ ملک تلاوت کیا کرتے تھے۔ اسی طرح

فجر کی نماز میں بالعموم آپؐ اس سورۃ مبارکہ کو پہلی رکعت میں اور سورۃ دہر کو دوسری رکعت میں پڑھا کرتے تھے۔ خاص طور پر یہ معاملہ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں ہوتا تھا۔

اس سورۃ مبارکہ کا انداز خطابی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک شعلہ بیان خطیب نہایت جوش و خروش کے ساتھ خطبہ دے رہا ہو۔ اس اعتبار سے اس میں ایک مطابقت ہے سورۃ یٰسٓ کے ساتھ چنانچہ اس کے اثرات بھی بالکل سورۃ یٰسٓ کے اثرات کے مشابہ ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایمان کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا ہو۔

اس کا اہم ترین حصہ پہلا رکوع ہے جو ۱۱ آیات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلی آیت تو حروفِ مقطعات پر مشتمل ہے الٓمٓ۔ بقیہ دس آیات میں سے پہلی دو آیات میں قرآن مجید کی صداقت و حقانیت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کا اثبات ہے اور منکرینِ رسالت کی تردید کی گئی ہے نہایت پرجوش انداز میں۔

آخری دو آیات میں منکرین قیامت کا ذکر ہے اور ان کی تردید کی گئی ہے نہایت پرزور اسلوب سے۔ درمیانی چھ آیات میں ذات و صفات باری تعالیٰ کا بیان بھی ہے۔ نہایت پرشکوہ انداز میں، نہایت پرجلال انداز میں اور اللہ تعالیٰ کے اعمال و افعال میں سے جو چوٹی کا عمل ہے یعنی تخلیقِ انسانی، اس کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔

آغاز میں ارشاد ہوتا ہے۔

الٓمٓ ۝ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

اس کتاب کا نزول اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے یہ اس ہستی کی طرف سے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ

کیا ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اس کتاب کو محمد نے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خود تصنیف کر لیا ہے۔

بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ
نہیں اے نبیؐ! یہ تو حق ہے آپؐ کے ربّ کی جانب سے ۔
لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ
لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝

تاکہ آپؐ خبردار کردیں اس قوم کو جس کے پاس آپؐ سے پہلے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا ۔ شاید کہ وہ لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرلیں ۔

آخری دو آیات میں فرمایا ۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۭ

وہ یہ کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہاں ان کا یہ کہنا تمسخر اور استہزاء کا انداز لئے ہوئے ہے کہ جبکہ ہم زمین میں گم ہوجائینگے مٹی ہوکر مٹی میں مل جائیں گے ۔ رل مل جائیں گے تو کیا پھر دوبارہ ہمیں اٹھالیا جائے گا ۔

بَلْ هُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝ (۱۰)

اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں ۔

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ۔

اے نبیؐ! ان سے کہہ دیجئے تم کہیں گم نہیں ہوجاؤ گے بلکہ وہ ملک الموت، وہ موت کا فرشتہ جو تم پر مامور کردیا گیا ہے جن کے تم حوالے کئے گئے ہو وہ تمہیں پوری طرح وصول کرلے گا ۔ اپنے قبضے میں لے لے گا ۔

ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۱۱)

اور پھر تم اپنے ربّ کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے ۔

پس جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ۔ ان میں ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کے ضمن میں منکرین کا ذکر اور ان کے غلط فکر کی تردید پر زور انداز میں کی گئی ہے درمیان میں چھ آیات میں ذات وصفات باری تعالےٰ کا ذکر ہے ۔ اور خاص طور پر تخلیق انسانی کے بعض مدارج کا تذکرہ ہوا اور یہ بات ذہن میں رہے کہ اس ضمن میں قرآن مجید نے جو حقائق منکشف کئے ہیں ، بالآخر سائنس بھی وہیں پہنچ کر رہی علم الحیات (BIOLOGY) کے محققین بہر حال

اسی نتیجے تک پہنچے کہ روئے ارضی پر سلسلۂ حیات جو پایا جاتا ہے چاہے اس کی کتنی متنوع یا لاتعداد صورتیں ہوں ان سب کا منبع اور سرچشمہ یہ زمین ہے۔ OF THE EARTH ہے یہ CLAY ہے، یہ مٹی ہے جس سے یہ سارا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ آغاز میں فرمایا جاتا ہے۔

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۝

اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی تخلیق فرمائی بہت ہی عمدہ بہت ہی اعلیٰ ہے۔ بہت ہی حسین تخلیق فرمائی۔ اور انسان جو اس کی تخلیق کا نقطۂ عروج ہے CLIMAX ہے اس کی تخلیق کا آغاز اس نے فرمایا مٹی سے۔ اس کے بعد حیوانات میں جو سلسلہ تناسل چلتا ہے اس کی طرف اشارہ ہوا جو دوسرا درجہ ہے۔ ارتقائے حیات کا دوسرا مرحلہ ہے۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۝

پھر اس کی نسل کو رکھ دیا ہے، وہ پانی بہت ہی حقیر پانی جو سلالہ ہے، اس کے ذریعے سے نسل آگے بڑھتی ہے۔ اس کے بعد آخری مرحلے کا ذکر ہے جب ارتقائے حیات اس درجہ تک پہنچا۔ یہ حیوانی انسان جسے جدید سائنس دان HOMOSECULAR کے نام سے جانتے ہیں، وجود میں آیا۔ تو اب وہ مرحلہ آیا کہ رُوحِ ربانی اس میں پھونکی جائے۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

یہ ہے وہ مرحلہ جس کا ذکر ہمارے سلسلہ کلام میں اس سے پہلے سورۂ صٓ میں آچکا ہے۔ وہاں پر بھی یہ باتیں فرمائی گئی تھیں اگرچہ قدرے مجمل انداز میں:

فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۔

جب اس پتلے میں اس حیوانی انسان میں رُوحِ ربانی پھونکی گئی تو حضرت

آدم وجود میں آئے۔ تب انسانِ اوّل تخلیق پایا اور پھر اس کے سامنے سجدے کا حکم دیا گیا فرشتوں کو۔ یہ ہے اس سورۃ مبارکہ کے پہلے رکوع کے مضامین کا خلاصہ۔ اور لفظ تشکرون یا قلیلاً ما تشکرون سے اس کا ایک ربط و تعلق ہے جو سورۃ لقمان کے ساتھ عائد ہو جاتا ہے۔ جس کے مضامین کا اصل، اور بنیاد جذبۂ تشکر ہے۔

دوسرے رکوع میں احوالِ آخرت کا ذکر ہے۔ اہلِ جہنم کی حالت زار بھی بیان ہوئی ہے۔ اہلِ جنّت کے احوال بھی بیان ہوئے ہیں اور اس کے ضمن میں الفاظ آئے ہیں۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۔

یہ جو اللہ کے نیک بندے ہیں جو جنّت میں داخل کئے جائیں گے کوئی نہیں جانتا وہ کون سی نعمتیں ہیں جو اللہ نے ان کے لئے رکھی ہوئی ہیں۔ جو انکی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو ایک حدیث رسولؐ میں بھی آئی ہے۔

کہ جنّت کی نعمتوں کو تم اس دُنیا کی نعمتوں پر قیاس نہ کرو۔ صرف ناموں کا اشتراک ہے جنّت کی نعمتوں کی حقیقت تو وہیں جا کر معلوم ہو گی۔

ما لاعین رأت ولا اذن سمعت ولا علی قلب بشر خطرت۔

اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے وہ نعمتیں وہ ہیں کہ جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں نہ کسی انسان کے دل میں ان کا کبھی کوئی خیال تک آیا۔ ہاں تمہارے ذہن سے قریب لانے کے لئے تمثیل کے پیرائے میں نعمتوں کا ذکر کر دیا گیا ہے لیکن اصل حقیقت وہیں جا کر معلوم ہو گی۔

آخری رکوع میں جو چند مضامین آئے ہیں ان میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا ذکر اور تورات کا ذکر اس کے بارے میں وہ الفاظ جو بنی اسرائیل میں بھی آئے ہیں کہ: وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ ۔

یہ تورات بنی اسرائیل کے لئے ہدایت نامہ تھی - ان کے لئے راہنمائی بنکر نازل ہوئی تھی - یہاں تقابل کریجئے - قرآن مجید اپنے آپ کو ہدًی للناس قرار دیتا ہے - پوری نوعِ انسانی کے لئے ہدایت نامہ، ہدایت کاملہ، ابدالآباد کے لئے خواہ کتنے ہی تغیرات آئیں انسانی تہذیب وتمدن کتنے ہی مراحل میں سے گزرے ہر دور کے لئے رہنمائی اس کتاب قرآن حکیم کے اندر موجود ہے - ہر نسل کے لئے ہر قوم کے لئے تمام تاریخی اور جغرافیائی حالات کیلئے قرآن کے اندر یہ رہنمائی موجود ہے - ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ بنی اسرائیل میں سے ہم نے کچھ لوگوں کو انسانوں کی رہنمائی کے منصب پر فائز کیا -

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا --

ہم نے ان میں ایسے رہنما اٹھائے جو خلقِ خدا کو ہمارے حکم سے ہدایت کی راہ کی طرف بلاتے تھے - لیکن اس کے لئے ایک شرط لازم ہے کہ "لَمَّا صَبَرُوْا" جبکہ خود انہوں نے صبر کی روش اختیار کرلی - یہ صبر ہے کہ اس کا دامن اگر ہاتھ سے چھوٹ جائے تو پھر انسان قعرِ مذلت میں جا گرتا ہے -

ناموافق حالات ہوں، مصائب ومشکلات ہوں، مخالفتوں کا طوفان ہو- خواہ انسان کے اپنے اندر سے اٹھنے والے طوفان ہوں یعنی نفس کے شہوات، اور خواہشات کے طوفان خواہ باہر سے آنے والی ترغیبات ہوں یا مخالفتوں کا معاملہ ہو- ان سب کے مقابلے میں انسان صبر وثبات کے ساتھ ڈٹا رہے -

"لَمَّا صَبَرُوْا" وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ -

اور اس صبر کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ کی آیات پر یقین کامل ہو- پختہ یقین ہو یقین محکم ہو - آخری بات سورۂ مبارکہ میں فرمائی -

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ

اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ان منکرین، ان مخالفین سے اعراض فرمائیے - انہیں نظر انداز کردیجئے - ذرا دیر کے لئے ان کی طرف سے توجہ ہٹا دیجئے - وَانْتَظِرْ اور انتظار کیجئے - اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ

بقیہ صد ۲ پر

(قسط ۲)

ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات

(سورہ تغابن کی روشنی میں)

ڈاکٹر اسرار احمد

اب تیسری آیت آگے پڑھئے۔ فرمایا خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ تخلیق کیا۔ یہ مضمون بھی دو دفعہ میں بیان ہو چکا ہے اور لفظ حق کی تشریح ہو چکی ہے۔ اب تیسری بار بطور اعادہ عرض کر رہا ہوں۔ حق کا اصل مفہوم ہے "وہ چیز جو فی الواقع موجود ہو" اور باطل اصلاً اس کو کہتے ہیں جو نظر تو آئے، محسوس و مشہود تو ہو لیکن حقیقتاً موجود نہ ہو۔ جیسے سراب۔ لیکن اس مفہوم اصلی پر چند مفاہیم زائد ہیں۔ حق ہر وہ چیز ہے جو عقلاً مسلم ہو اس کے مقابلہ میں باطل وہ ہے جو عقلاً مسلم نہ ہو۔ حق ہر وہ چیز ہے جو اخلاقاً ثابت ہو اور اس کے مقابلہ میں باطل وہ چیز ہے جو اخلاقاً ثابت نہ ہو۔ حق ہر وہ چیز ہے جو بامقصد PURPOSEFUL ہو جس کے پیچھے کوئی حکمت کارفرما ہو اور باطل و عبث ہر وہ فعل ہے جو بامقصد نہ ہو اور جس کی پشت پر کوئی حکمت نہ ہو۔ یہاں یہ لفظ حق اسی آخری مفہوم میں استعمال ہوا ہے

اس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق مقصد کے ساتھ کی ہے۔ اس کی ایک منصوبہ بندی (PLANNING) ہے۔ اس کی باقاعدہ نقشہ کشی ہے، اس کی حکمتیں اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ کارِ عبث نہیں ہے۔ یہ کارِ باطل نہیں ہے۔ یہ فعل عبث نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے سورۃ آل عمران کے آخری رکوع کے درس میں پڑھا تھا کہ سلیم الفطرت اور صحیح العقل لوگ اس کائنات کی تخلیق پر تدبر و تفکر کرنے کے بعد جس نتیجے تک پہنچتے ہیں وہ ان کی زبان پر ان الفاظ سے آتا ہے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ سُبْحٰنَكَ تو اس سے پاک ہے، اعلیٰ و ارفع ہے، منزہ ہے کہ تیرے بارے میں یہ گھٹیا تصور قائم کیا جائے کہ تو نے اس کائنات کو یونہی پیدا کر دیا اور اس کا کوئی مقصد نہیں سُبْحٰنَكَ۔ پاک ہے تیری ذات اس گھٹیا تصور سے۔ یہاں یہ بات کیوں کہی گئی ہے؟ اس کو اچھی

طرح سمجھ لیجئے۔ مذاہب کی دنیا میں ایک فکر یہ بھی رہا ہے کہ جب انسانوں کی عقل درماندہ و عاجز ہو گئی اور ان کو کائنات کے مقصد کی طرف حقیقی توجہ کی توفیق نصیب نہ ہوئی تو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو بس رام کی لیلا ہے۔ جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ، بے شعور اور ناسمجھ بچہ بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا ہو، وہ کسی وقت کوئی کھلونا اٹھاتا ہے اور پھینک دیتا ہے اور کبھی کوئی کھلونا ادھر سے ادھر کر دیتا ہے، تو اب اگر کوئی شخص یہ تلاش کرے کہ اس کھلونے کے پھینکنے اور اٹھانے میں کیا حکمت تھی تو ایسے شخص کو دیوانہ اور پاگل ہی کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ اس بچہ کے کھیل میں حکمت اور مقصد کی تلاش ایک فعلِ عبث ہے۔ چنانچہ اسی تصور پر انہوں نے اپنے مذہب کی اساس رکھی اور اس کارخانۂ عالم کو "رام کی لیلا" قرار دے دیا کہ رام بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا ہے جس کو چاہتا ہے، اٹھا کر اوجِ ثریا پر بٹھاتا ہے جس کو چاہتا ہے، اٹھا کر تحت الثریٰ میں دے مارتا ہے۔ ابھی کوئی لاکھوں میں کھیل رہا ہوتا ہے اور کل دہلی کی گلیوں میں بھیک مانگتا پھر رہا ہے۔ تو یہ سب کچھ بس ایک کھیل ہے جو رام کھیل رہا ہے۔ یہی تصور ایک دوسرے انداز سے یونانی اور رومی مذاہب (GREEK AND ROMAN RELIGIONS) میں کارفرما رہا ہے ان کی مائتھالوجی کا مطالعہ کیجئے تو ان کا یہ تصور سامنے آئے گا کہ ان کے نزدیک یہ پوری دنیا بہت بڑا سرکس ہے، ایک بہت بڑا امپی تھیٹر ہے اور اس میں جو چاروں طرف اونچے اونچے اور بڑے بڑے پہاڑ ہیں، وہاں وہ دیوی اور دیوتا بیٹھے ہوئے ہیں۔ شراب پی رہے ہیں، رنگ رلیاں منا رہے ہیں اور اس دنیا کا تماشا دیکھ رہے ہیں کہ اس اسٹیج پر اداکار کس طرح اپنا اپنا پارٹ انجام دے رہے ہیں۔ جس طرح انسان سرکس اور تھیٹر میں تماشے دیکھا کرتا ہے اور جس طرح وہ اپنے امپی تھیٹروں میں بیٹھ کر انسانوں کو شہروں سے پھروا تے اور چروا تے ہیں اور یہ تماشا دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح دیوی اور دیوتا بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں اور لطف اندوز ہو رہے ہیں کہ کشت و خون ہو رہا ہے، جنگیں ہو رہی ہیں، زلزلے آ رہے ہیں۔ یہ تصور مذاہب کی دنیا میں رہا۔ لہٰذا اس کی نفی ہوئی "مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ ۔ یہ بات تو اس خالق کے تصور کے ساتھ بڑی ہی گری ہوئی بات ہے۔ اگر اس کو کسی کھلنڈرے بچے پر قیاس کریں یا اسے تماش بینی کا شوقین سمجھیں تو یہ بڑی گھٹیا بات ہے۔ سُبْحٰنَكَ ۔ اے اللہ تیری ذات اس سے پاک ہے۔ ان تمام تصورات سے تو اعلیٰ و ارفع ہے، بلند و بالا ہے، منزہ ہے۔ یہی بات سورۃ مومنون کی ان آیات میں آئی۔ "اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ ۝ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا، بے مقصد پیدا کیا؟ اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟ تو وہ اللہ ملک الحق، وہ بادشاہ حقیقی تمہارے اس خام خیال اور باطل تصورات سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی حاکم نہیں۔ وہ عرش کریم کا مالک ہے۔ وہ علی الاطلاق شہنشاہ ہے اور یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس نے یہ کارخانہ محض کھیل تماشہ اور بے نتیجہ و بے انجام تخلیق کیا ہو ــــ یہ دلیل قرآن مجید میں بار بار آئی ہے اور یہاں اس آیت کے چھوٹے سے ٹکڑے میں درحقیقت یہی دلیل ہے۔ وہاں منفی انداز میں تھی، یہاں مثبت انداز میں ہے۔ وہاں فرمایا اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا ۔ استفہامیہ انداز اور نفی کے ساتھ۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۔ خبریہ انداز لیکن نفی کے ساتھ اور ان دونوں چیزوں کو ایک مثبت اسلوب میں یہاں بیان کر دیا گیا۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو ایک مقصد اور حکمت کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ حکیم ہے اور کمال حکمت والا ہے۔ اس کے بارے میں یہ تصور نہ صرف گھٹیا بلکہ باطل ہے کہ وہ بیکار اور عبث تخلیق کرے۔ فعل عبث اس کی جلالت کے شایان شان نہیں ہے بلکہ اس کے منافی ہے۔ اس گفتگو کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ آگے اس کا بیان موجود ہے۔ فرمایا: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ صَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ" کائنات کی بالحق تخلیق کے ذکر کے بعد ذہن کو منتقل کیا گیا کہ اب اپنی طرف آجاؤ۔ چونکہ حاصل تخلیق تو تم ہی ہو۔ جیسا کہ میں پچھلے درس میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو بیان کر چکا ہوں " اِنَّمَا الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ " اس دنیا کا مرکزی وجود تو تم ہو، اس میں کوئی شک نہیں اور یہ دنیا، یہ کائنات تمہارے لئے ہی تخلیق کی گئی ہے۔ لہٰذا صَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ غور کرو تمہاری تصویر کشی اس نے کی ہے پس کتنی عمدہ کی ہے! کس قدر احسن تقویم پر تمہاری تخلیق کی کس طرح کی صلاحیتوں سے تم کو مسلح کر دیا۔ کس طرح کے ذرائع علم اور حواس تمہیں عطا کئے۔ تمہارے ظاہر و باطن میں کون کون سی قوتیں ودیعت کر دیں، تمہیں ادراکات اور احساسات کے کن کن ہتھیاروں سے نوازا۔ تمہارے شعور میں قوت متخیلہ، قوت واہمہ اور قوت اختراع و ایجاد جیسی کیا کیا نعمتیں رکھ دیں۔ تمہیں کیسا متناسب جسم عطا کیا اور اس میں کیسے کیسے متناسب اعضاء و جوارح رکھ دیئے۔ جن لوگوں نے ان باتوں پر غور کیا، انہیں کہنا پڑا کہ یہ انسان خود ایک عالم اصغر ہے، پوری کائنات اس کے اندر موجود ہے اور اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ خود

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلٰکِنْ یسعُنی قَلْبُ الْمُؤمِنِ " میں خود مومن کے قلب میں سما جاتا ہوں "۔۔۔ وَصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ۔ تمہاری صورت گری کی، نقش و نگار بنائے، احسن اور خوبصورت وجود تم کو بخشا۔ تو کیا یہ سب کچھ یوں ہی بنائے! بیکار بنائے؟ محض شوقیہ بنائے؟ اور بقول کسے ؎

تخلیق کائنات کی دلچسپ بھول پر، ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی!

کیا یہ تصوّر تمہارے ذہن کو اپیل کرتا ہے؟ اگر نہیں کرتا تو غور کرو اور یہ غور تمہیں جس نتیجہ تک پہنچائے گا، وہ یہ ہے کہ وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ۔ اسی کی طرف لوٹ کر جانا پڑے گا۔ جو کچھ تمہیں دیا ہے، اس کے متعلق تم سے پوچھے گا کہ تم نے کیا کیا! کس کس طرح کیا! ان صلاحیتوں سے کیا کام لیا؟ ان قوتوں کو کس کام میں لگایا؟ جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا، " لن تزول قدما ابن آدم یوم القیامۃ من عند ربہ" اللہ کی عدالت سے کسی انسان کے دونوں قدم ہٹ نہیں پائیں گے جب تک کہ پانچ سوالوں کا جواب نہیں لیا جائیگا۔ حَتّٰی یُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ۔ پوچھ گچھ ہوگی، اچھی طرح محاسبہ ہوگا عَنْ عُمُرِہٖ فِیْمَا اَفْنَاہُ۔ عمر کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ یہ مہلتِ عمر جو ہم نے عطا کی تھی کس چیز میں کھپائی؟ کہاں فنا کی؟ اور عمر کے متعلق خاص طور سوال ثانی ہوگا وَعَنْ شَبَابِہٖ فِیْمَا ابلاہ " کہ جوانی کو کس حالت میں گنوایا" یہ خاص دور جو عمر کا ہے۔ یہ شباب کا دور، قوتوں والا دور، عزائم والا دور، ہمتوں والا دور۔ جب جسم و جان میں خون کی حرارت اپنا اظہار کر رہی ہو۔ پوچھا جائے گا کہ کس دور کو کہاں کھپایا؟ کہاں ضائع کیا؟ پھر پوچھا جائے گا۔ عَنْ مَالِہٖ مِنْ اَیْنَ اِکْتَسَبَہٗ وَفِیْمَا اَنْفَقَہٗ، مال کے بارے میں سوال ہوگا، کہاں سے کمایا تھا؟ حلال سے یا حرام سے جائز طریقہ سے یا ناجائز سے؟ کہاں خرچ کیا تھا؟ گل چھرے اڑائے تھے، تبذیر میں اڑایا تھا، اسراف کے حوالے کیا تھا۔ ابناءِ نوع پر رعب گانٹھنے کے لئے خرچ کیا تھا۔ یا یہ کہ جن جن کے حقوق متعین کر دیئے گئے تھے، ان کے حقوق کی ادائیگی میں صرف کیا تھا اور آخری بات جو پوچھی جائے گی وہ یہ ہے وَمَاذَا عَمِلَ فِیْمَا عَلِمَہٗ " اور اپنے علم کے بارے میں کہ اس پر کتنا عمل کیا؟ کہ جو کچھ تمہیں علم حاصل ہوا، دین کی جو حقیقت تم پر واضح ہو گئی، خدا کے عائد کردہ فرائض کا جو علم تمہیں حاصل ہو گیا، دین کی جو ذمہ داریاں سمجھ میں آ گئی تھیں ان پر عمل کتنا کیا؟ علم کے کتنے بھرتے چلے گئے، انسائیکلوپیڈیا بنتے چلے گئے۔

اپنے دماغوں کو علم کی بہت بڑی لائبریری بنا رکھا ہے یا یہ کہ جو کچھ سمجھا اور علم حاصل کیا، اس کے مطابق عمل بھی کیا کہ نہیں ؟ یہ سوالات ہو کر رہیں گے۔ اگر یہ کائنات بامقصد ہے، اگر یہ فعلِ تخلیق عبث نہیں ہے اور یہ نظام کائنات اللہ کا فعلِ باطل نہیں ہے تو یقیناً سوال و جواب ہوگا، محاسبہ ہوگا، جزا سزا ہوگی۔ وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ۔ وہ تمام استدلالات جو ہم نے سورہ آلِ عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی آیات میں پڑھے تھے۔ یہاں ایک دوسرے اسلوب اور انداز سے پھر بیان ہوئے لیکن ترتیب وہی ملے گی۔ اگر آپ اس ترتیب کو اپنے ذہن میں مستحضر کریں گے تو قرآنِ مجید کے طرزِ استدلال کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ اور قرآن مجید کے مطالعہ کے دوران آپ کو یہی طرزِ استدلال راہنمائی کرتا ملے گا۔ قرآن کو سمجھنے کیلئے باہر سے کوئی طرزِ استدلال لا کر نہ ٹھونسئے بلکہ خود قرآن ہی سے معلوم کیجئے کہ وہ کیا طرزِ استدلال اختیار کرتا ہے۔ اور کیا دلائل پیش کرتا ہے اور حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ قرآن حکیم کے دلائل جتنے قوی اور اطمینان بخش ہیں اس سے زیادہ قوی اور تسلی بخش کوئی دلیل پیش کرنا ممکن ہی نہیں جتنی دلیلیں قرآن سے باہر تراشنے کی کوششیں کی گئی ہیں منطق کے صغریٰ اور کبریٰ ملا کر جو دلائل بنائے گئے ہیں، ان میں قطعاً کوئی زور نہیں ہے۔ بڑے سے بڑے متکلم اور فلسفی کو یہ کہنا پڑا کہ "اَمُوْتُ عَلٰی عَقِیْدَۃِ اُمِّیْ۔ میری ساری قیل و قال دھری رہ گئی ہے۔ میں تو اپنی ماں کے عقیدے پر جان دے رہا ہوں۔ جیسے وہ بلا دلیل خدا کو مانتی تھی ویسے ہی میں بھی بلا دلیل خدا کو مانتا ہوں۔ اگر کوئی علم کلام اور منطق کے گورکھ دھندے میں پھنس گیا تو سواالسبیل سے گویا بھٹک گیا۔ لیکن اگر قرآن حکیم کا جو اپنا طرزِ استدلال ہے اس کو سمجھئے تو درحقیقت یہی ہے ایمان افروز استدلال یہ ہے ایمان کو تقویت دینے والا استدلال۔ یہ ہے ایمان کی راہنمائی کرنے والا استدلال۔ اور یہ استدلال فطرت کے بدیہیات پر قائم ہے۔ یہ منطق کے مسلّمات پر قائم نہیں ہے۔ منطق کا ایک مسلمہ، دوسرے مسلمہ کو توڑ دے گا۔ لیکن فطرت کے بدیہیات کو توڑ دینے والی کوئی چیز نہیں۔ ماسوائے اس کے کہ انسان کی خود فطرت ہی مسخ ہو گئی ہو تو ظاہر بات ہے کہ یہ مرض لاعلاج ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس پر تعصب، عناد، ضد اور ہٹ دھرمی غالب آگئے ہوں تو اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی جاگتا ہو لیکن بہانہ کر کے سویا ہوا ہو تو اس بناوٹی سونے والے کو جگانا ممکن نہیں۔ سوئے ہوئے کو تو جگایا جا سکتا ہے مگر جو بناوٹی سونے والے کو جگانا امر محال ہے، لہٰذا ایسے انسانوں پر کوئی دلیل کارگر نہیں ہو

مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے۔اب بتائیے کوئی چیز باہر رہ گئی! لیکن پھر ایک اور پہلو سے بات ہو رہی ہے ایک اور رُخ اور زاویہ کے ساتھ DIMENSIONS، گفتگو کی جا رہی ہے۔ وَیَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۔ اور کہیں یہ مغالطہ نہ ہو جائے کہ ہمارے جو پوشیدہ ارادے ہیں، انہیں وہ کہاں جانتا ہوگا۔ لہٰذا بتا دیا گیا کہ وہ جانتا ہے وہ جو کچھ تم چھپاتے ہو اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ مبادا کوئی ابہام رہ جائے۔ لہٰذا آخر میں فرمایا " وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ" تمہاری نیتیں، تمہارے ارادے، تمہارے محرکاتِ عمل جن پہ اصل جزا و سزا کا دار و مدار ہے وہ تو یہی محرکاتِ عمل ہیں نہ کہ وہ ظاہری اعمال جو تم سے ظہور میں آ رہے ہیں۔— اللہ تعالیٰ نہ تمہاری صورتوں کو دیکھتا ہے اور نہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ ۔ اس کی تو نگاہ ہی تمہارے قلوب پر ہے۔ وہاں کیا حال ہے؟ وہاں کیا کیفیت ہے؟ وہ تو دیکھتا ہی اس کو ہے تو فرمایا " اور اللہ تمہارے سینوں میں چھپے ہوئے ارادوں سے بھی باخبر اور واقف ہے۔ یہاں چوتھی آیت ختم ہوئی اور ان چار آیتوں میں ایمان باللہ کا بیان مکمل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایمان بالمعاد کے لئے اساسات قائم کر دی گئیں۔

(جاری ہے)

بقیہ : الســو

یہ بھی انتظار کر رہے ہیں یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ آپ بھی انتظار کیجئے اللہ کا حکم کب آتا ہے۔ اس کی مدد کب آتی ہے اس کی حکمت بالغہ میں کس کام کے لئے کونسا وقت معین ہے یہ اسی کو معلوم ہے۔

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم
ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم

اسلام کو
حکمائے عصرِ حاضر کے تین چیلنج
جن کا جواب
علمائے اسلام کے ذمّے ہے

(شائع شدہ ماہنامہ "میثاق" اپریل ۷۴ء)

یہ ایک کھلا خط ہے جو مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے عزیزم ڈاکٹر ابصار احمد سلمہٗ کے نام اُن کی انگلستان سے واپسی کے فوراً بعد ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو لکھا تھا، بعض وجوہات سے اس کی اشاعت ملتوی ہوتی رہی۔ اب اسے محض بالکل ہی ذاتی نوعیت کے حصے حذف کر کے شائع کیا جا رہا ہے اس لئے کہ جیسا کہ خود چشتی صاحب مرحوم نے لکھا ہے، اس کے مخاطب صرف ڈاکٹر ابصار احمد نہیں بلکہ اُمّتِ مسلمہ کے تمام ذہین اور باصلاحیت نوجوان ہیں۔ اسرار احمد

برخوردار سعادتِ اطوار! اللہ تعالیٰ تمہیں سعادتِ دارین عطا فرمائے، اور فخرِ خاندان بنائے! چونکہ تمہیں میرے جذباتِ قلبی سے آگاہی نہیں ہے اس لیے تم میری مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جو علم کے میدان میں تمہاری شاندار کامیابیوں سے مجھے حاصل ہوئی ہے۔ انہی جذبات کے اظہار کے لیے یہ طویل خط نہیں لکھ رہا ہوں۔ اور چونکہ ان جذبات سے دوسرے مسلمان بھی مستفید ہو سکتے ہیں اس لیے یہ خط "میثاق" کے ذریعے سے تمہیں بھیج رہا ہوں۔ شاید تمہارے علاوہ اللہ کا کوئی نیک بندہ بھی میرے جذبات کو عملی جامہ پہنا کر داخلِ حسنات ہو سکے۔

تم مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے آگاہ ہو کہ موجودہ صدی انکارِ روح، انکارِ

خدا اور انکارِ عرفان (GNOSIS) وجدان (INTUITION) کی علمبردار ہے۔

اقبال کے مرشدِ معنوی اکبر الٰہ آبادی نے اس صدی کے آغاز یعنی ۱۹۰۲ء میں یہ شعر کہا تھا ؎

غزالی و رومی کی بھلا کون سنے گا — محفل میں چھڑا نغمہ اسپینسر و مل

تم تو ان دونوں سے واقف ہو، مگر اس خط کے بعض پڑھنے والے شاید واقف نہ ہوں اس لیے اتنی صراحت ضروری ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ان دونوں فلسفیوں کی تصانیف الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلِ نصاب تھیں اور یہ دونوں لاادریت کے مبلغ تھے، اور تم جانتے ہو کہ لاادریت انکارِ خدا، انکارِ روح اور انکارِ عالمِ آخرت کی طرف پہلا قدم ہے، ان کے مقابلے میں امام غزالی اور عارف رومی دونوں وجدان اور عرفان کے حامی ہیں۔

اگر اکبر آج زندہ ہوتے تو وہ اپنی آنکھوں سے شجرِ لاادریت کے اثمارِ تلخ کی ہر دلعزیزی کا مشاہدہ کر لیتے۔ ساری دنیا ان کو نوشدارو سمجھ کر کھا رہی ہے اور آبِ حیات کے دھوکے میں پی رہی ہے۔

مذہب اس صدی میں اپنے زوال کی آخری سرحدوں کو چھو رہا ہے اور اخلاقِ حسنہ پر عالمِ نزع طاری ہے۔ اور آج کافر نہیں، بلکہ مسلمان، اخلاقی اعتبار سے دنیا میں پست ترین قوم ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کفار (ہنود و مجوس و یہود و بودھ و نصاریٰ وغیرہم) اپنی مذہبی کتابوں اور ان کی تعلیمات سے آگاہ ہیں، لیکن مسلمان، من حیث القوم قرآن حکیم سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ وہ سب کچھ پڑھتے ہیں، صرف قرآن نہیں پڑھتے اور جو پڑھتے ہیں وہ اسے سمجھتے نہیں۔ اسی لیے مسلمانوں کے اندر تبلیغ کا جذبہ بالکل فنا ہو چکا ہے۔

یہ ذوقِ تبلیغ کے مردہ ہو جانے ہی کا نتیجہ ہے کہ بیسویں صدی میں یورپ نے مسلمانوں کو جو چیلنج دیے، آج تک کسی مسلمان کو ان کا جواب دینے کی توفیق نہ مل سکی۔ اللہ کا اٹل قانون ہے کہ توفیق اسی کو ملتی ہے، جو حصولِ توفیق کے لیے مجاہدہ (کوشش) کرے۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی اس پر شاہد ہے۔

میرے محدود مطالعے کی رو سے بیسویں صدی میں یورپ نے مسلمانانِ عالم کو

تین واضح چیلنج دیے ہیں :

(۱) پہلا چیلنج اس صدی کے آغاز غالباً سنہ ۱۹۱۱ء میں انگلستان کے شہرۂ آفاق فلسفی بریڈلے (F.H. BRADLAY) نے دنیا کے تمام حامیانِ مذہب کو دیا تھا۔

تم تو بریڈلے سے ضرور واقف ہو گے لیکن عام قارئین کی اطلاع کے لیے اس قدر صراحت ضروری ہے کہ میری رائے میں ہیگل کے بعد دنیا میں تصوریت مطلقہ ——— (ABSOLUTE IDEALISM) کا اُس سے بڑا علمبردار اور کوئی نہیں گزرا اور اس کا شاہکار "مظاہر اور حقیقت" (APPEARNACE & REALITY) کانٹ کے شاہکار "تنقید عقل خالص" (CRITIQUE OF PURE REASON) کے بعد، فلسفے کی دنیا میں سب سے بڑی تصنیف ہے۔ اور یہ رائے صرف میری نہیں ہے، بلکہ انگلستان کے مشہور فلسفی EDWARD CAIRD اور مشہور عالم الہیات ریشڈل (RASHDALL) کی رائے بھی یہی ہے۔ نیز ہندوستان کے مشہور فلسفی پی۔ ٹی۔ راجو (P.T. RAJU) کی رائے میں تو بریڈلے کا شمار دنیا کے عظیم حکماء میں سے ہے۔

بریڈلے نے تو اپنی تصنیف مذکورہ کے پہلے حصّہ میں مسلک مادیّین کی تردید میں ایسی براہین قاطع اور ادلّۂ ساطع جمع کردی ہیں جن کا جواب آج تک کسی مادہ پرست سے ممکن نہیں ہو سکا، اور نہ آئندہ ہو سکے گا۔ قدماء میں یونان میں زینو (   ) اور ہندوستان میں ناگارجن (بودھ دھرم) کے فلسفیانہ مدرسۂ فکر المسمّٰی بہ شونیلےواد کا عظیم ترین علمبردار منطقی موشگافیوں میں بریڈلے کے ہم پلّہ ہیں۔ بریڈلے کی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ عصرِ حاضر کا نامور فلسفی برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰ - ۱۸۷۲) جو تصوریت مطلقہ (ABSOLUTE IDEALISM) کا سخت مخالف ہے، بریڈلے کی عظمت و رفعتِ فکر کا ساری عمر معترف رہا۔ دیکھو، 'SCEPTICAL ESSAYS' P.39

آمدم برسرِ مطلب، بریڈلے نے اپنے مجموعہ مقالات موسومہ بہ ——— 'ESSAYS ON TRUTH & REALITY' کے ایک مقالے کے آخر میں (جس کا نام ہے 'ON GOD AND THE ABSOLUTE' ہے

یہ قابلِ غور پیراگراف لکھا ہے :

"میرے خیال میں دنیا کو اس وقت ایک نئے مذہب کی ضرورت ہے جس کے لیے کچھ تقاضے بھی ہونے لگے ہیں۔ ہمیں ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے، جو تمام انسانی اغراض اور مطالبات کو ایک خاص تناسب کے ساتھ ملحوظ رکھے اور ان کے جواز کا اعتراف کرے اور عقلِ انسانی کے لیے ایک ایسی بنیاد فراہم کرے جس پر پورے اعتماد سے بھروسہ کیا جاسکے۔ کیا ہم یہ نیا مذہب حاصل کرلیں گے؟ کیا یہ نیا مذہب موجودہ مذاہب میں ترمیم و تنسیخ کے ذریعے بنے گا یا کسی اور طریقے سے، میں اس کا فی الحال کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ لیکن جہاں تک میری بصیرت کام کرتی ہے، دنیا کے اس عام تقاضے کو پورا کرنا فلسفے کے بس کی بات نہیں ہے۔ مجھے اس امر میں بھی شک ہے کہ کسی مذہب کے اصول بالآخر ہماری "ULTIMATE CONSISTENCY" کی مابعد الطبیعاتی ضرورت کو پورا کرسکیں گے۔ میری رائے میں جس چیز کی ہم معقول طور پر خواہش کرسکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو ایک عقیدہ ہو اور دوسری طرف ایک تحقیقی فلسفہ، جو اس عقیدے کے لیے جواز اور استدلال مہیا کرے۔ میرا خیال ہے کہ کسی مثبت مابعد الطبیعاتی نظریے کی بنیاد باطنی تجربے پر ہونی چاہیے، جبکہ مذہب کی بنیاد اگر باطنی تجربے پر ہو تو وہ زندگی سے فرار اور محرومی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے ایک مذہبی عقیدہ جس کی بنیاد مابعد الطبیعیات کے سوا کسی اور چیز پر ہو یا ایسا مابعد الطبیعاتی فلسفہ جو کسی مذہبی عقیدے کی تائید کرسکے، ہماری خواہشات کو پورا کرسکتا ہے۔ ممکن ہے میں خود اس خواہش کو پورا ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکوں اور اگرچہ اس راستے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں لیکن پھر بھی میں اس کی تکمیل کو ممکن نہیں سمجھتا۔"

(اس کا اصل انگریزی پیراگراف ٹائمیل کے اندر کے صفحہ پر دیکھیں)

تمہاری آگاہی اور معلومات میں اضافے کی خاطر یہ بات ذیل میں درج کرنی چاہتا ہوں کہ اس پیراگراف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوسکتا ہے کہ پروفیسر

جیمس وارڈ نے اپنے آخری مقالے میں، جو انہوں نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے لکھا تھا، مرتومہ بالا پیراگراف کو من وعن نقل کیا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان ہے "ایمان اور حیاتِ ابدی"

خلط مبحث کے خوف سے میں اس مقالے کا تعارف پیش نہیں کروں گا لیکن وارڈ سے متعلق چند تعارفی الفاظ ضرور لکھنا چاہتا ہوں۔

یہ مذہبی فلسفی جو دراصل ایک عالم الٰہیات تھا، بریڈلے کا ہمعصر تھا۔ اُس نے بریڈلے سے ایک سال کے بعد ۱۹۲۵ء میں وفات پائی، اس کی دو کتابیں بہت مشہور ہوئیں

1. NATURALISM AND AGNOSTICISM. 1899

2. THE REALM OF ENDS: PLURALISM & THEISM. 1911

بریڈلے تصوریت مطلقہ کا علمبردار تھا اور جیمس وارڈ تصوریت کا مخالف اور حامیٔ مذہب عیسوی عالم تھا۔ لیکن اس نے بریڈلے کے اس چیلنج کو اس قدر وقیع اور لائقِ توجہ سمجھا کہ اپنے مقالے میں اس کو لفظ بہ لفظ نقل کیا اور اس سے ایمان کی اہمیت پر استشہاد کرنے کے بعد یہ تمنا ظاہر کی کہ "میں تو اب لبِ گور ہوں، کاش کیمبرج کا کوئی عالم الٰہیات، آکسفورڈ کے اس شہرۂ آفاق فلسفی کے چیلنج کا جواب باصواب لکھے۔"

وارڈ نے یہ مضمون ۱۹۲۵ء میں لکھا تھا مگر ابھی تک کسی نصرانی عالم نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی تثلیث، تجسّم اور کفارہ کا معتقد بریڈلے کے چیلنج کا جواب دے ہی نہیں سکتا۔

(۲)

۱۹۳۸ء میں لارڈ لوتھین نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جو خطبۂ تقسیم اسناد (CONVOCATION ADDRESS) دیا، اس میں اس نے بایں الفاظ مسلمانوں کو چیلنج دیا:-

"میرے عزیز مسلمان نوجوانو!

اس وقت یورپ روحانی اعتبار سے مُردہ[1] ہے۔ اور اخلاقی لحاظ سے

---

[1] مُردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام (اقبال)

مریض[1] ہے اور معاشی زاویہ نگاہ سے سخت مضطرب[2] ہے اور تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں[3] مار رہا ہے۔

وہ اپنی اجتماعی زندگی کے کسی مسئلے کو تسلی بخش طریقے سے حل نہیں کر سکتا۔ وہ اس وقت ایسے نظامِ حیات کی تلاش میں ہے جو اس کے روحانی، اخلاقی، سیاسی، معاشی، اور عمرانی مسائل کا تسلی بخش حل پیش کر سکے۔

اے نوجوانو! تمہارا دعوےٰ ہے کہ اسلام بنی آدم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس میں عقل، دل اور نگاہ تینوں کی تشفی بلکہ آبیاری کا سامان موجود ہے۔

لہٰذا میں تمہیں مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم تازہ گریجویٹوں میں سے جو لوگ اپنے دین کی صداقت پر پختہ یقین رکھتے ہیں، وہ اپنے دین کی تبلیغ کے لیے یورپ کے مختلف ملکوں میں مبلغ اسلام کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں اور اپنی زندگی اس مقدس کام کے لیے وقف کر دیں۔"

میرے بیٹے میں نے یہ چیلنج ۱۹۳۸ء میں پڑھا تھا۔ وہ رسالہ تو ضائع ہو گیا مگر چیلنج کا مفہوم اسی وقت میرے دل پر نقش ہو گیا تھا۔ لارڈ موصوف کا یہ خطبہ ہندوستان کے کئی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوا تھا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا۔

(۳)

تیسرا چیلنج پروفیسر ولیم منٹگمری واٹ نے ۱۹۵۶ء میں دیا۔ یہ فاضل شخص ایڈنبرا یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر ہے۔ اور اس نے بڑی جانفشانی اور تحقیق کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، شخصیت، کارہائے نمایاں اور آپ کے پیدا کردہ انقلاب پر دو کتابیں لکھیں۔

1. 'MOHAMMAD AT MECCA'
2. 'MOHAMMAD AT MADINA'

---

[1] یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد ! زیر گردوں رسم لادینی نہاد ! (اقبال)

[2] اک اضطراب ہے دنیا کو ناصبوری سے سبب یہ ہے کہ وہ محروم ہے حضوری سے ! (اکبر)

[3] تدرجِ خود فروزے کہ فرنگ داد مارا ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد (اقبال)

یہ دونوں کتابیں ایک خاص نہج پر لکھی ہیں اور جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے، انگریزی یا کسی اور زبان مثلاً اردو، فارسی اور عربی میں کسی شخص نے یہ اندازِ سیرت نگاری اختیار نہیں کیا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ دونوں کتابوں کے چھ سو صفحات پڑھ لینے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ عظمت کا کوئی نقش قاری کے ذہن پر قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے مستشرقین کی تصانیف کا طغرائے امتیاز۔

بہرحال اپنی دوسری تصنیف میں ص ۲۴۳ پر واٹ نے حسب ذیل الفاظ میں ساری دنیائے اسلام کو چیلنج دیا ہے:

> " اب مسلمان اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ محمدؐ تمام بنی نوعِ انسان کے لیے کردار اور اخلاق کا ایک مثالی نمونہ ہیں۔ یہ دعوےٰ کر کے وہ دنیا کو اس امر کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ حضورؐ کے اخلاق کا جائزہ لیں۔۔۔ کیا محمدؐ کی زندگی اور تعلیمات سے ایسے اصول سیکھے جا سکتے ہیں جو مستقبل کی دنیا کے لیے ایک واحد ضابطۂ اخلاق کی بنیاد بن سکیں؟

دنیا نے ابھی اس سوال کا حتمی جواب فراہم نہیں کیا۔ مسلمانوں نے محمدؐ کے متعلق اپنے دعوے کی تائید میں جو کچھ کہا ہے، وہ اس دعوے کے ابتدائی بیانات سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ کچھ عیسائی اس سے متأثر بھی ہوئے ہیں۔ دنیا محمدؐ کے متعلق، اس دعوے کا کیا جواب دیتی ہے، اس کا انحصار کسی حد تک اس بات پر بھی ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کا اپنا عمل کیا ہے۔ یہ بات ابھی مسلمانوں کے ذمّے ہے کہ وہ باقی دنیا کے سامنے اپنے دعوے کا بھرپور اور بہتر ثبوت پیش کریں۔ کیا مسلمان محمدؐ کی زندگی کی طرف پھر رجوع کر سکیں گے اور اس میں سے عالمگیر اصولوں کو ہنگامی خصوصیات سے الگ کر کے ایسے اخلاقی اصولوں کا انکشاف کر سکیں گے جو دنیا کی موجودہ حالت کو بہتر بنانے کے لیے ان کی جانب سے ایک تعمیری کوشش ثابت ہو۔ یا اگر یہ امر، توقع سے کچھ زیادہ ہے تو کیا مسلمان، کم از کم، یہ ثابت کرنے کے قابل ہو سکیں گے کہ محمدؐ کی زندگی متحدہ عالم کے اخلاق کے لیے مثالی انسان کی ایک قابلِ عمل مثال ہے۔ اگر وہ ایسا کرنے کے قابل ہو سکیں تو کچھ عیسائی یقیناً ان کی بات سننے کو تیار ہو جائیں گے۔

میں اپنی ذاتی رائے کو چھپانا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں مسلمان دنیا کی رائے کو متأثر کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے، کم از کم اخلاق کے میدان میں۔ عیسائی یورپ کو اس امر کا قائل کرنے کے لیے کہ محمدؐ کی تقلید سے اخلاق کے مثالی نمونے پیدا ہو سکتے ہیں، مسلمانوں کو تاحال بہت کم، بلکہ کوئی کامیابی حاصل ہی نہیں ہوئی۔

(MOHAMMAD AT MEDINA, PAGE 333-334, 1962)

میرے بیٹے! یہ ہیں وہ تین زبردست چیلنج جو عیسائی دنیا نے مسلمانانِ عالم کو اس صدی میں دیئے ہیں۔ ہماری قوم کے علمائے کرام اور صوفیانِ عظام چونکہ بالعموم انگریزی زبان سے ناآشنا ہیں اس لیے نہ وہ ان چیلنجوں کو پڑھتے ہیں اور نہ ان اعتراضات سے آگاہ ہوسکتے ہیں جو یورپ کا مذہبی طبقہ قرآن اور حاملِ قرآن پر دوسو سال سے کرتا چلا آرہا ہے۔ سچ کہا تھا کسی نے کہ" لاعلمی بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔" اسی لیے ہمارے علماء اور صوفیاء کی راتیں کسی قسم کی کشمکش میں نہیں گزرتیں اور اسی لیے تو وہ بڑے اطمینان سے تعیین تعدادِ رکعاتِ تراویح، قرأتِ فاتحہ خلف الامام، تقبیل الابہامین، رفعِ سبابہ، آمین بالجہر، رفع یدین اور الزاق الکعبین بلکہ امکانِ کذبِ باری اور امتناعِ نظیرِ پیغمبر جیسے مفید اور ایمان افروز مسائل میں منہمک رہتے ہیں۔[1]

رہے ہماری قوم کے انگریزی دان حضرات، تو وہ ان چیلنجوں سے تو آگاہی حاصل کر لیتے ہیں مگر چونکہ قرآن اور اس کی زبان دونوں سے نابلد ہیں (الّا ماشاءاللہ) اس لیے کسی چیلنج کو قبول نہیں کرسکتے۔ صرف چند لمحات کے لیے متأسف ہو کر "پھر کارِ دیگر" میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ خلاصۂ کلام اینکہ عربی دان اور انگریزی دان دونوں میں سے کوئی طبقہ کسی چیلنج کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔[1]

۱۔ اندریں حالات میں تمہیں ان تینوں چیلنجوں کو قبول کرنے کا مشورہ دیتا ہوں اور اسی غرض سے یہ خامہ فرسائی کی ہے۔ تم نے بفضلِ خدا انگلستان سے فلسفے میں

---

[1] واضح ہو کہ میں نے مثالاً یہ چند مسائل لاطائل درج کر دیے ہیں۔ اگر استقصار کیا جائے تو کئی صفحات سیاہ ہو سکتے ہیں۔

ماسٹر آف فلاسفی کی ڈگری بھی حاصل کی ہے اور فلسفۂ جدیدہ میں ڈاکٹریٹ کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

۲۔ تم ایک دیندار اور علم دوست خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔

۳۔ تم نے دینی ماحول میں پرورش پائی ہے۔

۴۔ تمہارے اندر دین کی تبلیغ کا جذبہ بھی موجود ہے اور

۵۔ تم دینِ اسلام کو علیٰ وجہ البصیرت بنی آدم کے لیے بہترین ضابطۂ حیات یقین کرتے ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہارے بڑے بھائی اخویم اسرار احمد سلمہٗ نے اپنی زندگی اشاعتِ قرآن کے لیے وقف کرکے تمہارے لیے ایک اعتبار سے اسوۂ حسنہ بھی پیش کر دیا ہے۔

لہٰذا اب جس طرح تمہارے بڑے بھائی نے اپنی زندگی دعوت الی القرآن کے لیے وقف کر دی ہے تم اپنی زندگی مغرب کو اسلام کی خوبیوں سے روشناس کرانے کے لیے وقف کر دو تو تمہیں وہ کامیابی حاصل ہو گی جو تمہارے پیش رو حضرات کو حاصل نہ ہو سکی۔ میں ان سب لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے بیسویں صدی میں اپنی زندگی تبلیغ کے لیے وقف کی۔ مگر ان میں سے کوئی شخص منطقی اور فلسفی نہیں تھا، اور اس لیے وہ اسلام کو دیہات میں تو پیش کر سکے، آکسفورڈ یا کیمبرج میں پیش نہ کر سکے۔

دیکھ لو ٹیگور اور رادھا کرشنن نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں ہندو دھرم کو پیش کر کے غیروں کی نگاہ میں کتنی شہرت اور اپنوں کی نظر میں کتنی عزت حاصل کی ہے۔ یہ میرے سامنے کی بات ہے۔ اگر مل سکے تو رادھا کرشنن کی 'AN IDEALIST VIEW OF LIFE' ضرور پڑھ لینا۔ یہ 'HIBBERT LECTURES' ہیں اور ان میں اس نے ہندوؤں کے فلسفیانہ مذہب یعنی 'VEDANTIC IDEALISM' کی برتری تمام مدارسِ فلسفہ پر ثابت کر کے اپنی علمیت اور ویدانت کی عظمت کا سکہ انگریزوں کے دل و دماغ پر جما دیا ہے۔ پروفیسر میکنزی، پروفیسر میور ہیڈ اور پروفیسر جوڈ کا اعتراف تو میں خود پڑھ چکا ہوں۔ ؎

(بقیہ صہ ۵۹ پر)

کتابیات ۱

سیرۃ الخلیل (باب دوم)

بیان و برہان کی خوش اسلوبی اور شہ زوری

مولانا الطاف الرحمٰن منوی

جس طرح انسانوں کی رنگتیں اور حلئے ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہوتی ہیں اور باوجود اوّلین و آخرین کی اس کثرت کے دو انسانوں کے رنگ و حلئے کی مکمل وحدت کی کوئی ایک مثال بھی دیکھی اور نہ سنی گئی ہے اسی طرح سے ان کی طبیعتیں اور ذہنیتیں بھی یکساں نہیں ہوتیں بلکہ فعل و انفعال اور تاثیر و تأثر میں متفاوت ہوتی ہیں۔ افتادِ سرشت کا یہ فرق ان کی زندگی کے ہر گوشے میں نمایاں ہوتا ہے۔ اور یہی وہ فطرۃ اللہ ہے جس کا ہر فرد بشر بلا کم و کاست غیر شعوری طور پر پابند ہوتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر عقل و فلسفے کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ ہر بات کو اسی کی روشنی میں دیکھتے اور اسی کی میزان سے تولتے ہیں جب تک کسی مدّعا کو عقلی دلائل کے حاصل اور نتیجے کے طور پر پیش نہ کیا جائے کوئی اعجوبہ اور کرشمہ ان کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو استدلال کی پیچیدگیوں سے گھبراتے ہیں فکر و نظر کی بھول بھلیوں سے اکتاتے ہیں درایت نام کی کوئی چیز پہچانتے ہیں اور نہ ہی درایتی نقد و جرح کا عمل جانتے ہیں ان کے ہاں رد و قبول کا معیار نرا وجدان ہوتا ہے جو کبھی تو بڑی آسانی سے کسی سیدھی سادھی اور بالکل ہی مبتذل قسم کی بات سے یکایک متاثر ہو جاتا ہے اور کبھی بمشکل ہی کسی غیر معمولی اور خرقِ عادت ادا سے۔

خدائے قدوس کی رحیمی و کریمی اور شفقت و مہربانی انسانوں کی ہدایت کے لئے انہی کی جبلّت اور صلاحیت کے مطابق انتظام کرتی ہے۔ تاکہ اگر کسی کے اندر توجہ و انابت کی ادنیٰ ترین رمق بھی موجود ہو تو صواب و ثواب سے محروم نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبیؑ کو بالخصوص اس نوع کے دلائل و معجزات دیئے جاتے ہیں جو اہل زمانہ کی ذہنی سطح اور استعداد سے قریبی رشتہ رکھتے ہوں نیز اظہارِ کمال کے لئے وہی میدان منتخب کیا جاتا ہے جس سے ابنائے قوم کے

زیادہ سے زیادہ دلچسپیاں وابستہ ہوں

تواریخ و آثار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بت پرستی کے ساتھ ساتھ ستارہ پرست بھی تھی۔ چنانچہ اسی تعلق سے نجوم و ہیئت میں ید طولیٰ رکھتی تھی۔ علامہ عباس محمود عقاد مصری " ابوالانبیاء" میں لکھتے ہیں۔

"تاریخی کھوج لگانے والوں نے بابل اور اشور کے آثارِ عتیقہ میں لوہے کی تختیوں پر ایسے بہت سے کلمات پائے ہیں جو قدیم علم الافلاک کی اصطلاحیں ہیں ان میں منازل و بروج کے اسماء بھی شامل ہیں اور کواکب و نجوم کے مجموعے بھی۔"

سائنسی آلات اور دوربینیں تو اس وقت تھیں نہیں جن کی مدد سے افلاک و کواکب کے محل وقوع اور حرکات و کیفیات کا عینی مشاہدہ کرتے۔ لہٰذا لازمی طور پر ماننا پڑتا ہے کہ ان کے علم و فن کا تمام تر دارومدار انیّات ـــــ وجود معلول سے وجود علت معلوم کرانے کے طریقۂ استدلال ـــــ پر تھا، اس قسم کے نجوم و ہیئت میں تحقیق و تفحص کی جن باریکیوں اور موشگافیوں سے سابقہ پڑتا ہے اور پھر ان بحثوں کے تداول اور جولانیوں سے انسانی ذہن کا جو سانچہ تیار ہوتا ہے۔ اور اثر اندازی و اثر پذیری کی جس ڈگر کا خوگر بنتا ہے اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی بڑی مناظرہ باز اور محبت طراز واقع ہوئی ہوگی اور محاجاۃ ہی کو وہ بنیادی اور آخری معرکہ سمجھتی ہوگی جس کا سر کرنا ہی کسی اہم مقصد کی طرف رسائی کا مؤثر ذریعہ بنتا ہو۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم نے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ ذکر میں اس کے مناظرات کو بڑی تفصیل اور اہتمام سے ذکر کیا ہے۔

لیکن اس تجزئے کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر قوم میں عوام کی تعداد خواص سے زیادہ ہوتی ہے جہاں نمرودی حکومت کے ارکین و اساطین اور بابل کی مذہبی نمائندگی کرنے والے پیشواؤں اور مقتداؤں کو فکر و دانش کی قوتوں سے رام کیا جا سکتا تھا۔ وہاں عوامی اکثریت کے اطمینان و تسلی کے لئے بھی پیغمبر کی ذات میں مناسب مواد ہونا ضروری تھا۔[1]

---

[1] مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اپنی کتاب "منصبِ نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" میں انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے طریقۂ تعلیم پر بحث کرتے ہوئے قرآنی دلائل کی نوعیت کے (باقی اگلے صفحہ پر)

حضورؐ کا ارشاد ہے :

نحن معاشر الانبیاء اُمرنا	ہم گروہ انبیاء کو حکم دیا گیا ہے کہ
ان ننزل الناس منازلھم	لوگوں کو ان کے حسب حال جگہوں
و نکلمھم علی قدر عقولھم	میں اتاریں اور ان کی عقل و حیثیت کے
	مطابق ان سے بات چیت کریں ۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبیؑ کو بالعموم اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بالخصوص انداز بیان کی بے ساختگی و دل نشینی اور طرز استدلال کی وہ متانت و شہامت بخشی کہ جس سے کیا خاص و کیا عام، سب کے سب یکساں طور پر متأثر ہوئے، آپؑ پہلے تو بڑی دلیری اور بے تکلفی سے ایک ایسی غیر معمولی فضا اور ماحول قائم کر لیتے جس کی وجہ سے خواص و عوام سب آپؑ کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ پھر بالکل ہی محسوس و مانوس قسم کے مظاہر سے مترشح انتہائی صاف سادہ اور یقینی مقدمات کو ایسی فطری ترتیب سے پیش فرما دیتے جس کے نتیجے میں ان کے مقصود و مدعا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہتا۔ آپؑ کا پیرایۂ بیان جذبات کو اپیل کرنے والا بھی ہوتا اور عقل کی قلابازیوں کی ساری راہیں مسدود کرنے والا بھی، یہی وہ حجتِ الٰہی تھی جو آپؑ کو اپنی قوم کے مقابلے میں اور ان پر غلبہ پانے کے لئے دی گئی تھی اور اسی کی بدولت آپ نے حق و باطل کے ہر معرکے میں برتری اور فوقیت حاصل کر لی اور یہی قرآنی ارشاد:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ	یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیمؑ کو ان
عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ	کی قوم کے مقابلے پر دی تھی ہم جس کے

(تسلسل) کے بارے میں امام غزالی کی کتاب "الجام العوام عن علم الکلام" سے نقل فرماتے ہیں ۔

" قرآن کے دلائل غذا کی طرح ہیں ان سے ہر انسان فائدہ اٹھاتا ہے اور متکلمین کے دلائل دوا کی طرح ہیں، ان سے چند لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور اکثر لوگ نقصان، بلکہ قرآن کے دلائل پانی کی طرح ہیں جس سے شیر خوار بچے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور قوی انسان بھی اور دوسری تمام دلیلیں غذا کی طرح ہیں جن سے قوی کبھی فائدہ اٹھاتے ہیں کبھی بیمار ہو جاتے ہیں اور بچوں کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچتا۔"

مَنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ	درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں۔ بیشک
عَلِيْمٌ (سورۃ انعام آیت ۸۳)	آپ کا پروردگار بڑا حکمت والا بڑا علم والا ہے

کا صحیح صحیح مصداق ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کے صفات و کمالات کی کمیت و کیفیت کا کما حقہٗ بیان تو نہ صرف یہ کہ آسان نہیں بلکہ ممکن بھی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل دو آیات پر غور فرمائیے!

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا	بے شک ابراہیم علیہ السلام عبادت الٰہی
لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ	میں ایک جماعت اور قوم کے بمنزلہ تھے
شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَ	اور یک رُخ رہنے والے تھے اور وہ
هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝	مشرکوں میں سے نہ تھے۔ اللہ کی نعمتوں
(سورہ نحل آیات ۱۲۰، ۱۲۱)	کے بڑے شکر گزار (اللہ نے) ان کو چن

لیا تھا اور انہیں سیدھی راہ پر ڈال دیا تھا۔

تو خلیل اللہ علیہ السلام کی جلالت شان کا حال معلوم ہوگا۔ لفظ امت نے واضح کر دیا ہے کہ آپ کی اکیلی شخصیت پوری جمعیت کے قائم مقام تھی یا جدید اصطلاح میں آپ کی ذات میں ایک ادارے کی خوبیاں مجتمع تھیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی ایک انسان کی سیرت بھی اس قدر منشعب اور عادات و خصائل اتنے متنوع ہوتے ہیں جن کا احاطہ بڑے دل گردے کی بات ہوتی ہے۔ اور پھر جب اس کی رنگا رنگی، گوناگونی اور بوقلمونی ایک جماعت کے مماثل ہو تو کس کی ہمت اور حوصلہ کہ اس کے استقصاء کا دعویٰ کر سکے، اسی مشابہت یا مماثلت بالامۃ سے خلیل اللہ علیہ السلام کے صفات و کمالات کی کیفیت پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ ہر صفت و کمال فرد میں اپنی ابتدائی حالت میں موجود یا زیادہ سے زیادہ وسطی شکل و صورت تک مرتقی ہوتا ہے۔ لیکن اجتماع میں دوسروں کی دیکھا دیکھی اور استعانت سے انتہا پر پہنچ جاتا ہے[1] نیز انہیں آیات میں قانت حنیف، شاکر، مجتبیٰ اور مہتدی الی صراط مستقیم جیسے الفاظ سے سیرت ابراہیمی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، کیفیت کے باب میں اس سے زائد کا امکان بھی موجود نہیں ہے بہر حال ان کے صفات و کمالات

---

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی کثرت کا تو یہ حال ہے

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار گلچینِ بہار تو ز دامان گلہ دارد

اور ندرت و رنگینی کا یہ عالم کہ ؎

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ایک فرانسیسی مفکر "لیبان" نے "جماعتہائے انسانی کی اصول نفسیہ" پر ایک کتاب لکھی ہے مدت ہوئی اس کے اردو ترجمہ "روح الاجتماع" کے مطالعے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"جماعت کے اعمال کا بیشتر حصہ کیفیات نیم شعوری کا معلول ہوتا ہے اور اس کے اعمال و افعال میں نخاع کی تاثیر دماغ کی تاثیر سے بہت زیادہ ہوتی ہے یعنی حالتِ اجتماع میں افراد پر بجائے کیفیتِ شعوری کے نیم شعوری کا غلبہ ہوتا ہے اور یہ خصوصیت ایسی ہے جس میں جماعت کے ساتھ وحشی انسان اور ناقص الشعور افراد بھی شریک ہیں اس بنا پر وہ افعال جو جماعت سے صادر ہوتے ہیں بعض اوقات گو تنقیدی حیثیت سے کامل ہوتے ہیں مگر چونکہ عقل کو اس کی رہنمائی میں بالکل دخل نہیں ہوتا اس لئے افراد جماعت کے دائرے میں اگر ان مؤثرات کی اطاعت کرنے لگتے ہیں جو ان کو عمل کی جانب مائل کر رہے ہوں۔ پس جماعت ہمیشہ ان مہیجات و عوامل کی قید میں مقید رہتی ہے اور ان مؤثراتِ خارجیہ کے سامنے سرنیاز جھکاتی ہے جو وقتاً فوقتاً اس پر اپنا اثر ڈالتے ہیں اور اس کے تقلبات اور تغیرات کا باعث ہوتے ہیں ہاں اگرچہ افراد کے حیات میں بھی اکثر یہی سانحہ پیش آتا ہے اور وہ بھی مؤثرات کے حلقے میں چاروں طرف سے گھر جاتے ہیں لیکن ان کی عقل ان کو مفرات سے آگاہ کرتی رہتی ہے۔ اس لئے وہ کبھی مؤثرات کے دام میں نہیں پھنستے ہیں۔ یہی بات ہے جس کی بنا پر "علم وظائف اعضاء" کے ماہرین نے کلیہ قائم کیا ہے کہ افراد اپنے اعصاب کو قابو میں رکھ سکتے ہیں اور جماعت نہیں رکھ سکتی۔"

بلاشبہ "لیبان" کی یہ تحقیق جس میں جماعت کی قوتِ عقلی کو فرد کی قوتِ عقلی سے فروتر ثابت کیا گیا ہے قرآنی تشبیہ کی اس تفسیر و تفصیل کی بھرپور تغلیط کرتی ہے جس کی بنیاد ہی فرد کی نسبت قوی جماعت کی بالاتری پر ہے اس کا ایک سیدھا سادھا اور آسان ترین جواب تو یہ ہے کہ اگر لیبان یا اس کے ہمنوا کا یہ خیال صحیح ہوتا تو قرآن و حدیث میں باہمی مشاورت کی تفصیل اور اس کی تاکید ہرگز موجود نہ ہوتی حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے اور ہمارے ہاں قرآن و حدیث کی مخالفت میں لیبان یا کسی بھی بڑے سے بڑے مفکر و محقق کی کوئی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ مے نگرم　　کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

گو ان کے گلشنِ شخصیت کا کوئی پھول بھی ایسا نہیں جس کی نزہت و بہجت سے آنکھیں خیرہ نہ ہوں تاہم " فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ " کا قانون یہاں بھی نافذ العمل ہے جس کی بدولت

(تسلسل) بات بھی پرکاہ کی بھی وقعت نہیں رکھتی ہے یہ لوگ قطعیات کے مقابلے میں ظنّیات بلکہ وہمیات تک سے استدلال کر جاتے ہیں اور طبیعت موج پر ہو تو جوشِ تحقیق میں فرضیات کو بھی مسلمات کا درجہ دینے سے نہیں چوکتے لیکن جب لیبانی نظریئے کی تصحیح بھی ممکن ہے تو اس کی کوشش سے بھی دریغ　　ہرگز نہیں ہونی چاہیئے تاکہ ان کی علمی تحقیق اور تحقیقی محنت کی تحسین اور حوصلہ افزائی کا حق بھی ادا ہو۔

تصحیح یا تطبیق کی صورت یہ ہے کہ لیبانی تحقیق انسانی معاشرت کی اس عوامی جماعت سے متعلق ہے جس کا ہر فرد اپنی انفرادی زندگی میں فی الجملہ عقل کی رہنمائی سے محروم اور جذبات کا محکوم ہو اب اس کی دو تقریریں ہیں پہلی تقریر میں لیبان کا خیال بلا کم وکاست اور دوسرے میں تجزیے کا تھوڑی سی خامی کے ساتھ صحیح قرار پاتا ہے۔

پہلی تقریر یہ ہے کہ جبکہ اس نوع کے عوامی اجتماع کے ہر فرد میں عقل مغلوب اور جذبات غالب ہوتے ہیں اور عقل مغلوب اس تقابل میں بے عقلی یا مناظرانہ احتیاط پیشِ نظر ہو تو کم عقلی ہی تو ہے تو جمعیت کی صورت میں جہاں افراد کے جذبات میں اضافہ ہوگا وہاں ان کی بے عقلی یا کم عقلی میں اضافہ نہ ہو تو کس چیز میں ہو!

دوسری تقریر یہ ہے کہ فرد و جماعت کے عقل و جذبات میں پیش رفت کی تعداد بالکل برابر سرابر ہے اور ان کے درمیان جو نسبت فرد میں ہوتی ہے جماعت میں بھی وہی نسبت قائم رہتی ہے چنانچہ جماعت میں جذبات کی زود افروختگی اور جلدی قابو میں نہ آنے کی وجہ ان کا غیر متناسب اضافہ ہرگز نہیں بلکہ اس کی وجہ جماعت میں جذبات کے راستے سے ان موانع کا دور ہونا ہے جو فرد میں بڑے مضبوطی سے جمے ہوئے ہوتے ہیں۔ فرد میں عقل و جذبے کا جو توازن قائم رہتا ہے وہ محض اس لئے کہ فرد جذبات کے اشتعال سے ہونے والے نقصانات کی وہ ذمّہ داری قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوتا جو اسی پر عائد ہو کر رہتی ہے۔ جماعت میں اس ذمّہ داری کا کوئی واضح تصوّر اور گہرا احساس نہیں ہوتا۔

بہرحال وجہ کچھ بھی ہو عوامی اجتماع کی یہ کمزوری بالکل مسلّم ہے جس کی لیبان نے نشاندہی کی ہے۔ لیکن اگر اجتماع ان لوگوں کا ہو جن کو اپنی انفرادی زندگی میں جذبات پر قابو حاصل ہوتا ہے یعنی ان کی عقل جذبات پر غالب ہوتی ہے تو جتنی جتنی جماعت بڑھے گی اتنی اتنی اس کی عقل و قوّت میں ترقی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے محض بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخاب کا کوئی تصوّر نہیں دیا ہے بلکہ فقط اہلِ حل وعقد ہی کی رائے کا اعتبار ہی کیا ہے۔ اکثر مغربین اور مستغربین ابھی تک اس کو اسلام کی ایک وجہِ تنقیص خیال کرتے رہے مگر اب انہی کے (باقی اگلے صفحہ پر)

ان کی مختلف خصوصیات میں باہمی فرق و تفاوت کا اقرار کئے بغیر رہا نہیں جاتا لیکن ان کی کس صفت و کمال کو دوسرے صفات سے بڑھ کر امتیاز حاصل ہے ؟ اس میں قطعیت کے ساتھ کوئی تعیین ممکن نہیں البتہ گمانِ غالب یہی ہے کہ انکی وہ علی الاطلاق تفویض و سپردگی جس کا چہرۂ روشن کسی قید و تخصیص سے داغدار نہ ہوا وہ ہی اس برتری کی سزاوار ہے۔

حق تعالیٰ کی جانب سے اپنی تمام تر مرضیات سے بیک وقت و یکسر دست برداری کا حکم صادر ہوا تو آپ نے بلا تأمل اپنی ہمہ وقتی اور ہمہ جہتی اطاعت و فرمانبرداری کا اعلان فرمایا۔ قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ اور خلیل اللہ علیہ السلام کے اس مکالمے اور عہد و میثاق کو اپنے مخصوص معجزانہ پیرایۂ بیان میں یوں ذکر فرمایا۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ	اور (وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے)
اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ	جب ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ

(سورۃ بقرہ آیت ۱۳۱)

(تسلسل) بعض حلقے عوامی جمہوریت کے خلاف آواز اٹھانے لگے ہیں اور تو اور دنیا کے سب سے بڑے اور مرکزی ادارے اقوام متحدہ کی ثقافتی مجلس "یونیسکو" کی اس تحقیقاتی رپورٹ میں جس کو دنیا بھر کے مفکرین نے مرتب کیا ہے جمہوریت کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی ہے :

"یہ لفظ مہمل ہے۔ اس کا مفہوم متعین نہ ہو سکا دورِ حاضر میں جمہوریت سے مہمل اور کوئی لفظ نہیں۔"

Democracy in world of nations, P. 64.

اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب "میری کہانی" میں جمہوریت کی غرض و غایت کی کیا اچھی تشریح کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں کر لیتی ہے۔"

مغربی جمہوریت کی بابت شاعرِ مشرق کے یہ اشعار کس قدر معنی خیز اور مبنی بر حقیقت ہیں۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں — بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

حکمبردار ہو جاؤ وہ بولے میں حکمبردار ہوں
سارے جہان کے پروردگار کا۔

پھر انہوں نے اس وعدے کو کس حد تک نبھایا؟ اور اس راستے کی مشکلات میں صبر و ثبات اور وفاداری و جاں نثاری کے کیا کیا نمونے قائم کئے اس کی تفصیلات تو اسی کتاب کے تیسرے باب کا اصل موضوع ہیں۔ اجمالی طور پر مندرجہ ذیل آیات سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ	اور ابراہیمؑ کے مذہب سے کون پھرے گا مگر وہی جس نے اپنے کو احمق بنا لیا ہو۔
(سورۃ بقرہ آیت ۱۳۰)	
وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى (سورۃ نجم آیت ۳۷)	اور ابراہیمؑ کے بھی جنہوں نے (احکام کی) پوری بجا آوری کی۔

یعنی حق تعالیٰ نے ملتِ ابراہیمؑ سے اعراض کو نری حماقت اور بے وقوفی قرار دیا ہے کہ وہ تو اسی تسلیم و رضا کا دوسرا نام ہے جس کی بنیاد و اساس پر ابراہیمؑ کی عملی زندگی استوار تھی، نہیں تو فقط قول بلا عمل سے اعراض پر اتنی تقبیح و تشنیع چہ معنی دارد! پھر وفّٰی کی توصیف سے صبر و ثبات کا جو اعلیٰ تصور دیا گیا ہے وہ فکر و عمل کی کسی معمولی سی کوتاہی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔
(جاری ہے)

بقیہ: اسلام کو حکمائے عصرِ حاضر کے تین چیلنج

من آنچہ شرطِ بلاغ است با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

خاک نشین بندۂ مسکین
یوسف سلیم چشتی الحسینی

لاہور
۱۶ اکتوبر ۱۹۷۳ء

مولانا محمد طاسین

مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت

قسط (۲)

کیا وہ معاملہ مضاربت تھا جو نبوّت سے پہلے رسول اللہؐ اور حضرتِ خدیجہؓ کے مابین طے پایا!

مضاربت کے متعلق جو آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں ان کو نقل کرنے اور ان پر بحث کرنے سے پہلے میں اس روائت کا ذکر کر دینا مناسب اور مفید سمجھتا ہوں جس کا تعلق اس معاشی معاملے سے ہے جو اعلانِ نبوّت سے تقریباً پندرہ برس پہلے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے درمیان طے پایا تھا کیونکہ اس روایت کو مضاربت کے جواز میں پیش کیا جاتا ہے اور اس کے متعلق اچھے اچھے علماءِ کرام بھی عجیب غلط فہمی میں مبتلا ہیں

یہ روائت طبقات ابن سعد، سیرت ابن ہشام، زرقانی شرح المواہب، عیون الاثر لابن سید الناس، سیرت الحلبیہ، دلائل النبوۃ لابن نعیم، خصائص الکبریٰ للسیوطی، سیرۃ النبویہ لابن کثیر، امتاع الاسماع للمقریزی، تاریخ طبری اور تاریخ البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر وغیرہ میں مختلف سندوں کے ساتھ مذکور ہے اور اس کے الفاظ میں شدید اختلاف ہے۔ ذیل میں اس کی کچھ تفصیل ملاحظہ فرمائیے: طبقات الکبیر لابن سعد میں ہے:

(۱) عن نفیسۃ بنت منیۃ اخت یعلی بن منیۃ قالت لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خمسا وعشرین سنۃ قال لہ ابوطالب انا رجل لا مال لی وقد اشتد الزمان علینا وھذہ عیر قومک، وقد حضر خروجھا الی الشام، وخدیجۃ بنت خویلد تبعث رجالا من قومک فی عیرانھا، فلو جئتھا فعرضت نفسک علیھا لاسرعت

الیك، وبلغ خدیجة ما كان من محاورة عمه له فارسلت الیه فی ذلك وقالت له انا اعطیك ضعف ما اعطی رجلا من قومك۔

(ص ۸۲، ۸۳ ۔ ج ۱۔ طبقات ابن سعد)

(ترجمہ) نفیسہ بنت منیہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک جب پچیس سال تھی تو ان سے ان کے مربی چچا ابوطالب نے فرمایا کہ شدید قحط سالی کی وجہ سے میرے پاس کوئی مال نہیں رہا۔ نادار ہو گیا ہوں۔ اور ادھر آپ کی قوم کا قافلہ شام جانے کے لئے تیار ہے اور خدیجہؓ بنت خویلد آپ کی قوم کے کچھ لوگوں کو اپنے قافلوں میں بھیج رہی ہے۔ اگر آپ اس کے پاس جائیں اور اس کو اپنے متعلق کہیں تو فوراً آپ کو بھیجنے کے لئے تیار ہو جائے گی' چچا بھتیجے کی اس بات کا جب حضرت خدیجہؓ کو علم ہوا تو اس نے اس بارے میں آنحضرتؐ سے فرمایا کہ اگر آپ میرے تجارتی قافلے میں شام جائیں تو میں آپ کو اس کا دوگنا دوں گی جو میں آپ کے قوم کے کسی دوسرے شخص کو دیتی ہوں۔

(۲) عن عبد اللہ بن محمد بن عقیل قال قال ابوطالب یا ابن اخ قد بلغنی ان خدیجة استأجرت فلانا ببكرین ولسنا نرضی لك بمثل ما اعطته فهل لك ان تكلمها؟ قال ما احببت، فخرج الیها فقال هل لك یا خدیجة ان تستأجری محمدا، فقد بلغنا انك استأجرت فلانا ببكرین ولسنا نرضی لمحمد دون اربع بكار، قال فقالت خدیجة لو سألت ذلك لبعید بغیض فعلنا فكیف وقد سألت لحبیب قریب۔ (ص ۸۲۔ ج ۱۔ طبقات ابن سعد)

(ترجمہ) عبداللہ بن محمد بن عقیل نے روایت کیا کہ حضرت ابوطالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا بھتیجے مجھے پتہ چلا ہے کہ خدیجہؓ نے فلاں آدمی کی اجرت دو جوان اونٹ طے کی ہے۔ جسے وہ تجارت کے سلسلہ میں شام بھیج رہی ہے اور ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ آپ کو بھی وہ اتنی ہی اجرت دے کیا آپ ان سے بات کرنا پسند کریں گے تو آنحضرتؐ نے فرمایا، میں یہ پسند نہیں کرتا، تو پھر ابوطالب خود حضرت خدیجہؓ کے پاس گئے اور کہا کہ آپ محمدؐ کو تجارتی سفر کے لئے اجیر بنانا چاہتی ہیں اور یہ بھی کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے فلاں شخص کی اجرت دو جوان اونٹ مقرر کی ہے لیکن ہم محمدؐ کے لئے چار سے کم اونٹوں پر راضی نہ ہوں گے تو حضرت خدیجہؓ

نے جواب میں کہا کہ اگر آپ کسی دوسرے اور دشمن کے لئے کہتے تو بھی ہم مانتے اور ایسے شخص کیلئے کیسے نہیں کریں گے جو آپ کا محبوب اور قریبی ہے۔

ان دو روائتوں کے بعد اسی کتاب طبقات ابن سعد میں جو تیسری روائت ہے وہ خاصی طویل اور پہلی روائت کا تتمہ ہے اس میں پہلے تو یہ بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابو طالب کو یہ بتایا کہ حضرت خدیجہؓ نے دوسروں کے مقابلہ میں ان کی اجرت دگنی مقرر کی ہے تو انہوں نے خوش ہو کر فرمایا یہ اللہ کی طرف سے ہے، دوسری بات اس میں یہ ہے کہ پھر آنحضرت، حضرت خدیجہؓ کے غلام میسرہ کے ساتھ شام گئے اور وہاں خرید و فروخت کی اور دوسروں کے مقابلہ میں ڈبل نفع ہوا۔ جب واپس آئے اور حضرت خدیجہؓ کو دوگنا نفع بتلایا تو وہ خوش ہوئیں اور جو اجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مقرر ہوئی تھی اسے دوگنا کر دیا، تیسری بات اس روایت میں یہ کہ آنحضرتؐ جب ملک شام کے مقام بصریٰ پہنچے تو ایک سایہ دار درخت کے نیچے آرام کیا وہاں نسطورا نامی ایک عیسائی راہب تھا جو میسرہ کو جانتا تھا۔ اس نے میسرہ سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ یہ دوسرے صاحب کون ہیں۔ میسرہ نے جب نام پتہ بتلایا تو اس نے کہا کہ یہ اللہ کے وہ آخری نبی ہیں جن کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خبر دی تھی اور یہ کہ اس درخت کے نیچے نبی کے سوا اور کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ چوتھی بات یہ کہ جب دوپہر کی دھوپ میں آپؐ سفر کر رہے ہوتے تو آپ پر دو فرشتے سایہ کرتے۔ یہ چیز حضرت میسرہ نے بھی بار بار دیکھی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عین دوپہر کے وقت مکہ معظمہ میں داخل ہو رہے تھے تو حضرت خدیجہؓ نے بھی دیکھی۔ درآنحالیکہ وہ بالاخانے سے باہر کی طرف دیکھ رہی تھیں اور وہ اس چیز سے بہت متاثر ہوئیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ طبقات ابن سعد کی ان مذکورہ روائتوں میں نہ صرف یہ کہ ایسا کوئی لفظ نہیں جس سے یہ مفہوم ہوتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو معاشی معاملہ کیا تھا وہ قراض و مضاربت کا معاملہ تھا بلکہ اس کے برعکس ان روائتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ معاملہ متعین اجرت پر کام کرنے کا معاملہ تھا اور یہ کہ سفر شام کے لئے جو اجرت مقرر ہوئی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے چار جوان اونٹ تھی۔

اب دوسری قدیم اور مستند کتاب سیرۃ النبویۃ لابن ہشام کی عبارت ملاحظہ فرمائیے!

قال ابن اسحاق: وکانت خدیجۃ بنت خویلد امرأۃ تاجرۃ ذات

شرف ومال تستأجر الرجال فی مالها وتضاربهم ایاہ بشیئ تجعله لهم وکانت قریش قوما تجارا، فلما بلغها عن رسول الله صلی الله علیه وسلم ما بلغها من صدق حدیثه وعظم امانته وکرم اخلاقه بعثت الیه فعرضت علیه ان یخرج فی مالها الی الشام تاجرا وتعطیه افضل ما کانت تعطی غیرہ من التجار مع غلام لها یقال له میسرۃ، فقبله رسول الله صلی الله علیه وسلم منها وخرج فی مالها ذلك وخرج معه غلامها میسرۃ حتی قدم الشام....

..... ثم باع رسول الله صلی الله علیه وسلم سلعته التی خرج بها واشتری ما اراد ان یشتری، ثم اقبل قافلا الی مکۃ ومعه میسرۃ، فلما قدم مکۃ علی خدیجة بمالها باعت ما جاءت به فاضعفا او قریبا۔ ص ۱۹۹، ج ۱، سیرت ابن ہشام

(ترجمہ) محمد بن اسحاق نے روایت کرتے ہوئے کہا: حضرت خدیجہؓ بنت خویلد ایک ایسی تاجر خاتون تھیں جو شرافت کے ساتھ بڑی مالدار بھی تھیں۔ اپنی تجارت میں واقف کار مردوں سے متعین اجرت پر بھی کام لیا کرتی تھیں اور اپنا مال ان کو بطور مضاربت منافع کے ایک حصہ پر بھی دیا کرتی تھیں اور قریش تو تقریباً سب ہی تجارت پیشہ لوگ تھے، جب حضرت خدیجہؓ رضی اللہ عنہا کو پتہ چلا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہایت راست گو، بڑے امانتدار اور اعلیٰ درجے کے کریم الاخلاق ہیں تو اس نے آپؐ کے پاس کسی کو بھیجا اور یہ پیشکش کی کہ اگر آپ بحیثیت تاجر کے میرے غلام میسرہ کے ساتھ مال کی خرید وفروخت کے سلسلہ میں ملک شام جانا چاہیں تو میں آپ کو اس معاوضے سے کہیں زیادہ دوں گی جو دوسرے تاجروں کو دیتی ہوں، آپ نے پیشکش قبول فرمائی اور میسرہ کے ہمراہ شام تشریف لے گئے، وہاں پہنچ کر وہ مال وسامان فروخت کیا جو ساتھ لے گئے تھے اور دوسرا مال وسامان خریدا جو ساتھ لانا چاہتے تھے، پھر میسرہ واپس مکہ کی طرف روانہ ہوئے، جب مال لے کر حضرت خدیجہؓ کے پاس مکہ مکرمہ میں آئے اور انہوں نے وہ مال بیچا تو وہ مال دگنا یا تقریباً دگنا ہوگیا، یعنی اصل سرمایہ بڑھ کر ڈبل ہوگیا۔

سیرت ابن ہشام کی اس روائت میں تُضَاعِفُ کا جو لفظ ہے اس سے یہ سمجھا گیا

کہ حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت صلعم سے جو معاملہ کیا وہ مضاربت کا معاملہ تھا حالانکہ یہ درست نہیں کیونکہ "تُضَارِبُھُمْ" سے پہلے "تستأجر الرجال فی مالھا" کے الفاظ بھی ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت خدیجہؓ لوگوں سے دو طرح کا معاملہ کیا کرتی تھیں۔ ایک متعین اجرت پر اور دوسرے مضاربت پر، اور یہ مطلب دوسری روائتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اب یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ طے پایا تھا وہ پہلی قسم کا معاملہ تھا یا دوسری قسم کا؟ تو قطع نظر اس سے کہ دوسری روایات میں اس کی واضح تصریح ہے کہ یہ معاملہ پہلی قسم کا تھا دو اونٹوں یا چار اونٹوں کے بدلے طے ہوا تھا۔ خود اس روائت میں بھی ایسے شواہد موجود ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ معاملہ مضاربت کا معاملہ نہ تھا بلکہ متعین اجرت پر کام کرنے کا معاملہ تھا۔ اوّل یہ کہ اس روائت میں ہے کہ اس تجارتی سفر میں حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے غلام میسرہ کو بھیجا جو گویا حضرت خدیجہؓ کی طرف سے آپؐ کے ساتھ شریکِ کار تھا جبکہ مضاربت میں یہ درست نہیں ہوتا کہ ربّ المال خود یا اس کا نمائندہ مضاربت عامل کے ساتھ شریکِ کار ہو، دوم یہ کہ اس روائت میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے غیر یعنی اونٹوں پر لدے ہوئے سامانِ تجارت کے ساتھ شام بھیجا اور آپ نے وہاں پہنچ کر پہلے اس سامان تجارت کو فروخت کیا اور پھر دوسرا سامان تجارت مکہ مکرمہ لانے کے لئے خریدا، اور مکہ مکرمہ پہنچ کر وہ سامان حضرت خدیجہؓ کے حوالے کیا جو انہوں نے خود فروخت کیا، حالانکہ مضاربت میں یہ درست نہیں ہوتا کہ ربّ المال، مضارب عامل کو سامانِ تجارت کی شکل میں مال دے بلکہ ضروری ہوتا ہے کہ نقد دراہم و دنانیر کی شکل میں مال دے اور سامانِ تجارت خریدنے اور بیچنے کی ذمہ داری اس پر ڈالے اور اسے اس امر کی پوری آزادی دے کہ وہ خود خریدے اور خود بیچے۔

اب کچھ وہ روایات ملاحظہ فرمائیے جن میں نہائت واضح طور پر صاف الفاظ میں یہ بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہؓ کے درمیان جو معاملہ طے پایا تھا وہ متعین اجرت پر تجارتی سفر کرنے کا معاملہ تھا۔ ان میں سے ایک روائت پیچھے طبقات ابن سعد کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ دوسری المستدرک للحاکم کی یہ روائت ہے جو اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے، یہ روائت السنن الکبریٰ للبیہقی میں بھی مذکور ہے:

عن جابر رضی اللہ عنہ قال استأجرت خدیجۃ رضی اللہ عنہا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفرتین الی جُرش کل سفرۃ بقلوص۔ ھذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ۔

ص ۱۸۲۔ ج ۳ ۔ ص ۱۱۸۔ ج ۶۔ السنن الکبریٰ

(ترجمہ) حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے متعین اجرت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مرتبہ مقام جُرش کی طرف سفرِ تجارت کا معاملہ کیا۔ ہر سفر ایک جوان اونٹنی کے بدلے۔ (یہ صحیح الاسناد ہے لیکن بخاری و مسلم نے اس کی تخریج نہیں کی)

جُرش ملک یمن کی ایک جگہ کا نام ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے لئے یمن کی طرف بھی دو تجارتی سفر کئے، ہو سکتا ہے کہ یہ شام کے سفر سے پہلے ہوئے ہوں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور حدیث جو امام بیہقی کے حوالے سے ابن کثیر نے سیرۃ النبویۃ اور البدایہ والنہایہ میں نقل کی ہے، اس طرح ہے۔

عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آجرت نفسی من خدیجۃ سفرتین بقلوص۔ ص ۲۶۶۔ ج ۱۔ السیرۃ النبویہ۔ ص ۲۹۵۔ ج ۲ البدایہ والنہایہ۔ ص ۱۱۸۔ ج ۶۔ السنن الکبریٰ للبیہقی کتاب الاجارۃ۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے خدیجہؓ سے دو مرتبہ متعین اُجرت پر تجارتی سفر کا معاملہ کیا، ہر سفر بعوض ایک جوان اونٹنی کے۔

واضح رہے کہ امام بیہقی نے مذکورہ دونوں روایتیں کتاب الاجارہ میں نقل کی ہیں۔ کتاب القرض میں نقل نہیں کیں۔

علامہ ابن سید الناس نے اپنی کتاب "عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر" میں ابن شہاب الزہری کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابن شہاب الزہری قال لما استوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وبلغ اشدہ ولیس لہ کبیر مال استأجرتہ خدیجۃ بنت خویلد

الی سوق حباشة وهو سوق بتهامة واستأجرت معه رجلاً آخر من قریش۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهو یحدث عنها ما رأیت من صاحبة لاجیر خیراً من خدیجة ما کنا نرجع انا وصاحبی الا وجدنا عندها تحفة من طعام تخبؤه لنا۔

ص ۵۰ - ج ۱

ابن شہاب زہری نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جوانی کو پہنچے آپ کے پاس زیادہ مال نہ تھا تو حضرت خدیجہؓ نے آپ سے متعین اُجرت پر بازار حباشہ کی طرف تجارتی سفر کا معاملہ کیا اور آپ کے ساتھ ایک قریشی سے بھی اسی طرح کا معاملہ کیا۔ ایک موقع پر اس ساتھی سے باتیں کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے اجیر کے ساتھ حسن معاملہ میں خدیجہؓ سے بہتر کسی کو نہیں دیکھا۔ ہم جب کبھی بھی لوٹ کر ان کے پاس جاتے ہیں تو ان کے پاس اپنے لئے کھانے کی کسی چیز کا تحفہ پاتے ہیں جو اس نے ہمارے لئے محفوظ رکھا ہوتا ہے۔

ابن شہاب زہری کی اس روایت سے بھی صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ جو تجارتی کام کیا تھا بحیثیت اجیر کے متعین اجرت پر کیا تھا بحیثیت مضارب کے نفع کے ایک حصہ پر نہیں کیا تھا۔

السیرۃ الحلبیہ جس کا اصل نام "انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون" ہے میں ایک روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ سفر شام سے واپسی پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ معظمہ کے قریب مرالظہران جو اب وادی فاطمہ کے نام سے مشہور ہے تو میسرہ نے آپؐ سے کہا: "ھل لک ان تسبقنی الی خدیجۃ فتخبرھا بالذی جری، لعلھا تزیدک بکرۃ الی بکرتیک، وفی روایۃ تخبرھا بما صنع اللہ تعالیٰ لھا علی وجھک"

ترجمہ: کیا آپ کے لئے یہ ہو سکتا ہے کہ آپ مجھ سے پہلے حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچ جائیں اور اسے اس غیر معمولی منافع کی خبر دیں جو آپ کی بدولت اس کو حاصل ہوا ہے شائد کہ وہ خوش ہو کر آپ کی اجرت کے دو اونٹوں کے ساتھ بطور انعام تیسرے اونٹ کا اضافہ کر دے۔

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین جو تجارتی معاملہ سفر شام سے متعلق ہوا تھا وہ متعین اجرت پر ہوا تھا، اس روایت کے مطابق دو جوان

اونٹوں پر اور ابنِ سعد کی روایت کے مطابق چار اونٹوں پر ہو سکتا ہے۔ حضرت ابو طالب کی جو بات چیت حضرت خدیجہؓ سے دو کی بجائے چار اونٹوں پر ہوئی تھی اس کا تذکرہ معلوم نہ ہوا ہو اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ جس طرح دوسرے شخص سے دو اونٹوں پر معاملہ ہوا ہے اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی دو ہی اونٹوں پر معاملہ ہوا ہوگا۔ لہٰذا ان دو روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

سیرت حلبیہ میں علامہ مقریزی کی کتاب امتاع الاسماع سے جو روایت نقل کی گئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: وآجر النبی صلی اللہ علیہ وسلم نفسہ من خدیجۃ سفرتین بقلوصین اور اجرت پر معاملہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ دو تجارتی سفروں میں دو جوان اونٹنیوں کے بدلے۔

خلاصہ یہ کہ حدیث، سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں اس تجارتی معاملہ سے متعلق جو اعلان نبوت سے بہت عرصہ پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مابین طے پایا تھا، جو مختلف روایات ملتی ہیں ان کے مجموعے سے دو باتیں صریح اور قطعی طور پر سامنے آتی ہیں: ایک یہ کہ حضرت خدیجہؓ اپنی تجارت کے سلسلے میں دوسروں سے جو کام لیتی تھیں وہ دو طرح پر تھا ایک متعین اجرت پر اور دوسرے مضاربت پر، اور دوسری بات یہ کہ حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تجارتی کام لیا وہ متعین اجرت پر تھا۔ مضاربت پر نہ تھا۔

لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ جن سیرت نگار حضرات نے یہ لکھا ہے کہ وہ معاملہ مضاربت کا معاملہ تھا۔ ان کے سامنے اس معاہدے سے متعلق سب روایات نہ تھیں بلکہ صرف سیرت ابنِ ہشام کی روایت تھی اور وہ بھی نامکمل، ورنہ وہ کبھی یہ نہ لکھتے کہ وہ معاملہ مضاربت کا معاملہ تھا۔ اور پھر کسی ایک نے ایک بات بلا تحقیق لکھ دی تو دوسرے اس کو نقل کرتے چلے گئے۔ اور یہ بات اتنی مشہور ہو گئی کہ گویا وہی اصل حقیقت ہے۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆

تبصرۂ کُتب

نام کتاب = سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کا اسلامی معاشی نظام سے موازنہ
مصنف = مولانا شمس الحق افغانی
ناشر = ادارۃ البحوث والدعوۃ الاسلامیہ، جامعۃ العلوم الاسلامیہ زرگری کوہاٹ۔
صفحات = ۱۶۰ قیمت مع پلاسٹک کور = ۱۴ روپے

زیرِ نظر کتاب کا پیش لفظ مولانا مفتی محمود مرحوم کا لکھا ہوا ہے۔ اور اس کی نئی ترتیب مولانا نصیب علی شاہ بخاری نے دی ہے۔ اس کتاب میں جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظامِ معیشت کا اسلامی نظامِ معیشت سے موازنہ کیا گیا ہے اور کتاب و سنّت سے استشہاد کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام کا نظامِ معیشت دُنیا کے ان دونوں بڑے نظاموں سے ہر لحاظ سے برتر صحیح اور کامل ہے۔ البتہ کتاب کے آخری حصہ چہارم میں بعض ایسی فلسفیانہ بحثیں موجود ہیں جن کا موضوع سے خاص تعلق نہیں ہے۔ اکثر حوالوں میں بھی اخبارات اور جرائد پہ اعتماد کیا گیا ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر یہ کتاب اسلام کے نظامِ معیشت کو دنیا کے دوسرے نظائے معیشت کے تقابل میں سمجھنے کے لئے بہت مفید ہے۔

(۲)

نام کتاب = ارکانِ اسلام
مرتّب = مولانا اشرف علی قریشی
ناشر = جامعہ اشرفیہ، پشاور (پاکستان)
صفحات = ۶۷۰ قیمت = ۵۰ روپے

زیرِ نظر کتاب میں اسلام کے بنیادی ارکان — نماز، زکوٰۃ، حج اور روزے

کے فضائل و مسائل کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مختلف اوقات و مقامات کے لحاظ سے بہت سی مسنون دعائیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں دعوتِ دین سے متعلق چند مفید باتیں بھی درج ہیں۔ قرآن و حدیث سے جگہ جگہ حوالے نقل کئے گئے ہیں اور فقہی مسائل میں فقہ حنفی پر اعتماد کیا گیا ہے۔

عام مسلمانوں میں دین سے غفلت اور لاپروائی کے اس دور میں ایسی کتاب یقیناً ہدایتِ دین کے پہلو سے نہایت مفید اور بابرکت ہے۔ مگر کتاب کے آخری حصے میں "بدعتی سے سلوک" اور "بدعتی کا احترام" جیسے عنوانات کے ذیل میں کچھ متشددانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے عامۃ المسلمین کے لئے بہت نافع اور قابلِ مطالعہ و عمل ہے۔

(۳)

نام کتاب = بازارِ رشوت
مصنف = منشی عبدالرحمٰن خان
ناشر = صدیقی ٹرسٹ، نسیم پلازا۔ نشتر روڈ۔ کراچی ۵
صفحات = ۱۷۶
قیمت = ۱۲ روپے

اس کتاب میں رشوت کی بے شمار صورتوں پر قرآن و حدیث کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ ہمارے پاکستانی معاشرے میں یہ لعنت روزِ اوّل ہی سے موجود ہے اور اس میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ رشوت کے مفاسد ظاہر ہیں۔ قرآن و حدیث کی رُو سے رشوت کی ہر صورت حرام ہے۔ موجودہ حکومت نے اس بُرائی کو ختم کرنے کے لئے صرف نوٹوں پر یہ عبارت تحریر کرادی ہے کہ "حصولِ رزقِ حلال عین عبادت ہے"۔ اور بس۔ اور اس لعنت کو ختم کرنے سے اپنی بے بسی کا اظہار کئی مواقع پر کر دیا ہے۔ یہاں تک معصومانہ طور پر کہہ دیا ہے کہ "اب تو رشوت کا ریٹ کئی گنا بڑھ گیا ہے"۔

اور یہ کہ "اگر لوگ رشوت نہ دیں گے تو کوئی رشوت نہیں لے گا" شاید "نفاذ اسلام کی داعی حکومت" کا رشوت کے بارے میں یہ طرزِ عمل بھی کوئی قابلِ فخر بات ہوگی
ع رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند -

(۴)

نام کتاب = عثمان ذوالنورینؓ
مصنف = مولانا سعید احمد اکبر آبادی
صفحات = ۳۵۲
قیمت = ۳۴ روپے
ملنے کا پتہ = سُنّی پبلی کیشنز - ابوہاب مارکیٹ - اُردو بازار، لاہور ۲

زیرِ نظر کتاب پاک ہند کے نامور عالمِ دین مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تالیف ہے - اس میں مولانا موصوف نے خلیفۂ راشد سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ایک جامع، مفصل اور مستند سیرت پیش کی ہے اگرچہ اس موضوع پر اردو زبان میں پہلے سے چند کتب موجود ہیں تاہم اس کتاب کی انفرادیت اپنی جگہ ہے - اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ولادت اور بچپن سے لے کر قبولِ اسلام اور پھر عہدِ نبوی اور خلافتِ شیخین تک کے احوال و سوانح کے ساتھ ساتھ آپ کی خلافت اور پھر شہادت تک کے تمام اہم واقعات کو نہایت جامعیت اور مستند تاریخی حوالہ جات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے - اندازِ تحریر تحقیقی اور عالمانہ ہے -

کتاب خوبصورت مجلّد ہے اور قیمت بھی مناسب ہے -

☆☆☆☆☆

بقیہ: حرفِ اوّل

احمد یار صاحب نہایت محنت اور لگن سے تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

بحمداللہ "حکمتِ قرآن" کو اس کے قارئین تک ہر ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں پہنچانے کا پروگرام کامیاب ہو رہا ہے۔ خاکسار

الصار احمد

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ——— اور

بعثتِ محمدی کی تمامی و تکمیلی شان ——— نیز

انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ———

ایسے اہم موضوعات پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کی

حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ ۴ روپے

مرکزی انجمن خدام القرآن ○ ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

نبی اکرم کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:
کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے

اس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے

ھدیہ فی نسخہ: تین روپے۔ تبلیغی مقصد کے لیے یک صد نسخوں پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا:

[illegible] صفحة 46

"There is, I should say, a need and there is even a certain demand for a NEW RELIGION. We want a creed to reorganise and justify in due proportion all human interests and at the same time to supply the INTELLECT with that to which is can hold with confidence. Whether we shall get this new religion, and if so, how, whether by modification of what exists or in some other way I am unable to surmise, but it is not so far as I see in the power of philosophy to supply this general demand. And I must doubt the possibility for religious doctrine able in the end to meet our meta physical requirement of ultimate consistency.

All that in my opinion we can reasonably desire is on one side a general faith and on the other side such a critical philosophy as would be able in some sense to justify end to support this faith. I think that any positive metaphysical doctrine must remain esoter is but a refuge amid general destitution. Therefore, a religious b founded otherwise than a metaphysics and a metaphysics a[illegible] some sense to justify that creed seem to me what is required to [illegible] our wishes. And though this fulfilment is a thing which I c[illegible] myself expect to see, and though the obstacles in its way are [illegible] ly great, on the other hand I cannot regard it as impossible

H. H. BRAIDAY ESSAYS ON TRUTH AND [illegible]
p.p. 446-47.

Regd L. No. 319?
HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE
Vol 3 | DECEMBER 1984 | No. 11

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان —— اور —— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے —— اور —— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک پیدا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ —— اور —— غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ